سورۃ الشوریٰ

نام:

اس سورت کا نام اَلشُّوۡرٰی ہے اور اس میں 5 رکوع اور 53 آیتیں ہیں۔ سورت کا نام اس عظیم الشان حکم سے لیا گیا ہے جسے مسلمانوں کی حکومت اور کل قومی کاموں کی بنیاد قرار دیا گیا ہے یعنی باہمی مشورہ سے امور کو طے کرنا۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس زمانہ کی ہے جب مسلمانوں کی نہ کوئی قوم بنی تھی نہ کوئی قومی کام طے ہونے والے تھے اور حکومت کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو مشورہ کا حکم دینا اور نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کے ساتھ اسے مسلمانوں کی عظیم الشان ضرورت قرار دینا بتاتا ہے کہ کس قدر اہمیت اس اصول کو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔

خلاصہ مضمون:

① سورت کے پہلے رکوع میں بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بھیجنے کی غرض یہ ہے کہ ام القریٰ سے شروع کر کے کل عالم کو انذار کریں یعنی بدی کے بدنتائج سے متنبہ کریں۔

② دوسرے رکوع میں بتایا کہ اسلام کا حق کل دنیا کو انذار کرنے کا ہے۔ اس لیے کہ اسلام ہی تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے۔

③، ④ تیسرے اور چوتھے رکوع میں مومنوں کو کامیابی کی بشارت دی ہے۔ کیونکہ اتنی عظیم الشان پیغام کی متحمل کوئی قوم نہ ہوسکتی تھی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائیدات اور نصرتوں کے وعدے اور آخری کامیابی کی بشارتیں نہ ہوں، جو ان میں ہر قسم کے مصائب کے برداشت کرنے کی ہمت پیدا کریں۔ اس موقعہ پر مسلمانوں کو مشورے کا حکم دیا۔ یعنی جب کامیاب ہوجائیں تو پھر حکومت کے صحیح اصول کو ہاتھ سے نہ دیں۔

⑤ اور آخری رکوع میں بتایا کہ بدی کے نمائندوں کے لیے آخر کار ہلاکت ہے اور زندگی کی بنیاد صرف قرآن کریم ہے، جس سے دنیا کی قوموں کو آئندہ کے لیے زندگی مل سکتی ہے۔

تعلق:

پچھلی سورت میں اسلام کے اطراف واکناف میں غلبہ کی پیشگوئی کی تو یہاں بتایا کہ اسلام کا پیغام کل عالم کے لیے ہے۔ اور اسلام سب اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے اور اصول اتحاد اقوام کی صحیح بنیاد رکھتا ہے۔

سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ (42) (62)

اٰیاتھا 53 — رکوعاتھا 5

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۝١ — (اللہ) بے انتہا رحم والا۔

عٓسٓقٓ ۝٢ — جاننے والا سننے والا قادر ہے۔(2952)

كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَ اِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝٣ — اسی طرح اللہ غالب حکمت والا تیری طرف وحی کرتا ہے اور ان کی طرف جو تجھ سے پہلے ہوئے۔(2953)

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝٤ — اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ بلند عظمت والا ہے

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ — قریب ہے کہ آسمان ان کے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان کے لیے بخشش مانگتے ہیں جو زمین میں ہیں۔

2952- ﴿عٓسٓقٓ ۝٢﴾ مفسرین ان حروف پر خاموش ہیں۔ ابن جریر نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے جو ان حروف کو آنے والے فتنوں پر لگاتے ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ س ہر ایک فرقہ کی عمر ہے جو ہونے والا ہے اور ق ہر ایک جماعت ہے جو ہونے والی ہے۔ مگر اس سے بھی کچھ مطلب نہیں کھلتا۔ اصل بات یہی ہے یہ کہ حروف اسماء الٰہی کے قائم مقام ہیں۔ یعنی ع عَلِيْمٌ۔ س سَمِيْعٌ اور ق قَادِرٌ کی جگہ اور پہلی آیت میں حٰمٓ رَحْمٰنٌ کی جگہ ہے اور وحی کا نازل فرمانا صفت رحمانیت کا تقاضا ہے۔ اور عَلِيْمٌ، سَمِيْعٌ، قَادِرٌ کا تعلق انذار، وحی کی مخالفت اور ابطال حق کرنے والوں کی سزا سے ہے۔

2953- ﴿كَذٰلِكَ﴾ یعنی اس کی مثل جو اس کی سورت میں ہے یا اسی طرح بواسطہ ملک وحی کرنا ہے۔ (ر) مگر ہوسکتا ہے کہ مراد یہ ہو کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کا جس کا ذکر ﴿حٰمٓ﴾ میں ہے یہ تقاضا رہا ہے کہ وہ وحی کرے گا۔

اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۵

سنو! اللہ ہی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (2954)

وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۫ وَ مَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶

اور جولوگ اس کے سوائے مددگار بناتے ہیں، اللہ ان پر نگہبان ہے۔ اور ان کا معاملہ تیرے سپرد نہیں کیا گیا۔

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ تُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝۷

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف قرآنِ عربی وحی کیا ہے، تاکہ تو بستیوں کے مرکز کو ڈرائے اور ان (سب) کو جو اس کے ارد گرد ہیں اور اس اکٹھا ہونے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ بہشت میں ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں۔ (2955)

2954- **اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت:** ﴿فَوْقِهِنَّ﴾ میں ضمیر بعض نے سماوات کی طرف ہی لی ہے اور مراد ان کی جہت فوقانیت یا اوپر کی سمت ہے اور بعض نے ضمیر کو جماعات کفار کی طرف لیا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ یعنی کفار کا ظلم تو اس قدر ہے کہ آسمان ان کے اوپر سے پھٹ پڑتے مگر اس کی صفات میں رحم اس قدر غالب ہے کہ اس کے فرشتے لوگوں کے لیے بخشش مانگتے ہیں اور اس روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے جو سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے اور دوسری طرف ان الفاظ قرآنی کو مدنظر رکھتے ہوئے جو دوسری جگہ عیسائیت کے متعلق فرمائے ہیں: ﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝۹۰ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝۹۱﴾ [مریم: 19:90-91] ''قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ عیسائی اقوام کی طرف ہے۔ یعنی ان کے عقائد باطلہ تو ایسے ہیں کہ ان پر آسمان پھٹ پڑیں مگر ان کے بعض افعال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو تباہ نہیں کرے گا۔ اگلی آیت میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

2955- **﴿يَوْمَ الْجَمْعِ﴾ سے مراد** قیامت کا دن لیا گیا ہے کیونکہ اس میں مخلوقات جمع ہوگی اور یا ارواح اور جسم جمع ہوں گے یا اعمال اور عمل کرنے والے جمع ہوں گے اور دوسری جگہ ہے ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ﴾ [التغابن: 64:9] ''جس دن کہ وہ تمہیں جمع ہونے کے دن کے لیے اکٹھا کرے گا۔'' (ر) لیکن حق و باطل کے فیصلہ کرنے کے لیے ایک جمع ہونے کا دن اس دنیا میں بھی آنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا﴾ [السبأ: 34:26] ''کہہ ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا پھر

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَہُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوۡنَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۸﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو انہیں ایک ہی گروہ بناتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ اور ظالموں کے لیے کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ہُوَ الۡوَلِیُّ وَ ہُوَ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ۫ وَ ہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۹﴾ ع 1 9 2

کیا انہوں نے اللہ کے سوائے مددگار بنائے ہیں۔ سو اللہ ہی مددگار ہے اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَ مَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیۡ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۬ؕ وَ اِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ﴿۱۰﴾

اور جو تم کسی بات میں اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے، یہ اللہ میرا رب ہے۔ اس پر میں بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (2956)

ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا۔'' اور اس لیے یہاں دونوں کی طرف اشارہ ہے۔

﴿اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا﴾ کے انذار پر [دیکھو نمبر: 982] اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا انذار پہلے اس قوم کے لیے ہے جو اس سے فائدہ اٹھا کر دنیا کے لیے ماں کا کام دے یعنی دنیا کی روحانی تربیت کرے۔ گویا بتایا ہے کہ خاتم النبیین کی بعثت کا مرکز وہی مقام ہوسکتا تھا جو دنیا کا مرکز ہے۔ جب تک پہلے اس میں انذار نہ ہو۔ دوسری قوموں کا انذار نہ ہوسکتا تھا کیونکہ اس قوم نے دوسری قوموں کے لیے منذر بننا تھا۔

2956- [آیت:8] میں **اختلافات امم کا ذکر** تھا تو فرمایا کہ اس اختلاف مذہبی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کرسکتا ہے۔ کیونکہ جب ساری قومیں اپنے اپنے اندر رسولوں کا آنا مانتی تھیں اور تمام قوموں میں سخت اختلافات پیدا ہو چکے تھے تو ان کا فیصلہ کس طرح ہوسکتا تھا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نئی وحی نہ آتی۔ یہی ﴿فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ سے مراد ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تو ہمیشہ ایک ہی دین کی تلقین کی ہے یعنی اسلام یا اللہ تعالیٰ کی کامل فرمانبرداری کا دین اور تمام انبیاء کا ایک ہی مذہب تھا اسی کے اصل اصول کو اسلام کا اصل الاصول قرار دے کر اختلافات مذہبی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جب پہلے رکوع میں آپ کی بعثت کو ام القریٰ سے شروع کر کے کل عالم کے لیے قرار دیا تو اب بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ہی

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ؕ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے پیدا کیے اور چار پایوں کے بھی جوڑے (پیدا کیے)، وہ اس (طرح) سے تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔ اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ (2957)

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫

آسمانوں اور زمین کے خزانے اسی کے ہیں۔ وہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

تمام اختلافات مذہبی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کل عالم کا مذہب ہو۔

2957- ﴿مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا﴾ سے مراد ہے کہ چار پایوں کے جوڑے ان کی جنس سے پیدا کیے جس طرح انسان کے جوڑے انسان کی جنس سے پیدا کئے اور یا مراد ہے کہ تمہارے فائدہ کے لیے حیوانات کے جوڑے پیدا کئے یا قسم قسم کے حیوان پیدا کئے۔ اور ﴿يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ﴾ سے مراد ہے کہ اس تدبیر سے وہ تمہیں پھیلاتا ہے یعنی تعلق زوجیت کی غرض یہ ہے کہ ان کے درمیان توالد ہو اور انسان اور حیوان کی نسل پھیلے۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ مِثْل کے معنی بیان ہو چکے ہیں۔ اور یہاں کاف کو جو تشبیہ کے لیے ہے اور مِثْل کو تاکید نفی کے لیے جمع کیا ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ نہ مِثْل کا استعمال صحیح ہے نہ کاف کا۔ اس لیے دونوں امور کو جمع کیا اور بعض کے نزدیک مثل یہاں بمعنی صفت ہے یعنی اس کی صفت جیسی کوئی صفت نہیں اور اس میں تنبیہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کی صفات میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے ساتھ انسان کی صفات کو بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ صفات اس طرح پر نہیں جس طرح بشر میں ہیں۔ یعنی اس کی صفات بشر پر قیاس نہیں کی جاسکتیں۔ (غ) مثلاً اس کا دیکھنا سننا ایسا نہیں جیسا بشر کا ہے اور اس کا بنانا ایسا نہیں جیسا بشر کا ہے۔ کیونکہ بشر آلات اور مادے کا محتاج ہے خدا نہیں۔ اور بعض نے مِثْل سے مراد یہاں ذات لی ہے یعنی مراد یہ ہے کہ اس کی ذات جیسی کوئی شے نہیں۔ جیسے عرب کہتے ہیں [مِثْلُكَ لَا يَبْخَلُ] اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تو بخیل نہیں۔ (ر) اور یہاں یہ ذکر اس مناسبت سے کیا ہے کہ اوپر انسانوں اور حیوانات میں توالد و تناسل کا ذکر تھا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی رستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح کو حکم دیا تھا اور جو ہم نے تیری طرف وحی کیا اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکوں کو وہ بھاری معلوم ہوتا ہے جس کی طرف تو انہیں بلاتا ہے۔ اللہ اپنے لیے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اسے اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے۔ (2958)

وَ مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

اور انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد جو ان کے پاس علم آ گیا، آپس کے حسد کی وجہ سے۔ اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے سے ایک وقت مقرر کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب ورثہ میں ملی، وہ اس کے متعلق سخت شک میں ہیں۔ (2959)

2958- **اصل اصول ادیان:** یہاں بتایا کہ دین کا اصل اصول تو ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ چنانچہ جو حکم اب دیا جاتا ہے یہی نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ اور نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے درمیان ﴿وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ﴾ لا کر اس وحی کی عظمت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور ﴿اَقِيْمُوا الدِّيْنَ﴾ میں دین سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی کامل فرمانبرداری ہے۔ یعنی اصل اصول سب دینوں کا یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جانیں اور اسی کی فرمانبرداری کریں۔ اور آگے فرمایا کہ مشرکوں کو شرک چھوڑ کر ایک اللہ کو ماننا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے اور یہ حالت ہر قوم کی ہے جس نے جو شرک بنایا ہے اس شرک کے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔

2959- ﴿مَا تَفَرَّقُوْٓا﴾ میں ضمیر ان انبیاء کی امتوں طرف ہے۔ یعنی سب انبیاء کو تو ایک ہی دین توحید الٰہی دے کر بھیجا گیا تھا، مگر اس کے علم کے آنے کے بعد پھر لوگوں نے باہم تفرقہ کیا۔ ﴿كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ﴾ یہ ہے کہ اختلافات عقائد پر یہاں سزا نہیں دی

فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ ۚ وَ اسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ ۚ وَ قُلۡ اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَكُمۡ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمۡ ؕ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَكُمۡ اَعۡمَالُكُمۡ ؕ لَا حُجَّةَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَكُمۡ ؕ اَللّٰهُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا ۚ وَ اِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ ؕ﴿۱۵﴾

سو تُو اسی کی طرف بلا۔ اور سیدھی راہ پر چلتا رہ جیسا تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ میں اس پر ایمان لایا جو اللہ نے کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رب اور تمہارا رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے عمل۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہمیں جمع کرے گا اور اسی کی طرف انجام کار پھر کر آنا ہے۔ (2960)

وَ الَّذِیۡنَ یُحَآجُّوۡنَ فِی اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِیۡبَ لَهٗ حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَ عَلَیۡهِمۡ غَضَبٌ وَّ لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ﴿۱۶﴾

اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں اس کے بعد کہ اس کی بات مان لی گئی ان کا جھگڑا ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر ناراضگی ہے اور ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ (2961)

جاتی اور ﴿اُوۡرِثُوا الۡكِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ﴾ سے مراد آنحضرت ﷺ کے زمانہ یا اس کے بعد کے لوگ ہیں کہ وہ اس حق میں جو نہایت واضح تھا شک کر رہے ہیں۔

2960- ﴿فَلِذٰلِكَ﴾ سے مراد لی گئی ہے کہ اس تفرقہ کے سبب سے لوگوں کو راہ حق کی طرف بلاتے رہو مگر اصل مراد اسی اصل الاصول کی طرف بلانا ہے جو سب دینوں کی تعلیم مشترک ہے۔ اور اسی لیے آگے فرمایا ﴿اٰمَنۡتُ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ﴾ اور اسی اصول مشترک کی طرف اشارہ ہے ﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمۡ﴾ میں۔ اور ﴿حُجَّةَ﴾ اصل میں مصدر بمعنی احتجاج یعنی جھگڑا ہے۔

2961- **اسلام کا قیام اس کی صداقت کی دلیل ہے:** ﴿مِنۡۢ بَعۡدِ مَا اسۡتُجِیۡبَ لَهٗ﴾ یعنی بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی بات کو بہتیرے لوگوں نے قبول بھی کر لیا یعنی دین اسلام قائم ہو گیا، کیونکہ ایک یہ بھی صریح شہادت صداقت اسلامی کی تھی کہ سخت ترین مخالفت کے باوجود لوگ اسے قبول کرتے جاتے تھے۔ اور اس زمانہ کے لیے یہ دلیل بالخصوص قابل غور ہے کہ عیسائیت نے ساری دنیا پر تسلط حاصل کر کے اسلام کو مٹانا چاہا مگر ان کی سب کوشش ﴿حُجَّتُهُمۡ دَاحِضَةٌ﴾ کی مصداق ہے اور وہ خود بھی اسے محسوس کر رہے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ﴿۱۷﴾

اللہ وہ ہے جس نے کتاب اور میزان کو حق کے ساتھ اتارا اور تجھے کیا خبر ہے شاید (موعودہ) گھڑی نزدیک ہی ہو۔ (2962)

یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۱۸﴾

اس کے لیے وہی جلدی کرتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے اور جو ایمان لائے وہ اس سے ڈرنے والے ہیں، اور وہ جانتے ہیں کہ وہ سچ ہے۔ سنو! جو لوگ (موعودہ) گھڑی کے بارے میں جھگڑتے ہیں وہ پرلے درجے کی گمراہی میں ہیں۔ (2963)

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿۱۹﴾ ع 2 10 3

اللہ اپنے بندوں پر لطف کرنے والا ہے وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور وہ طاقتور غالب ہے۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ ۚ وَ مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَ مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ ﴿۲۰﴾

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے اس کی کھیتی میں برکت دیتے ہیں اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس میں سے کچھ اسے دے دیں گے اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ (2964)

2962- ﴿اَلْمِیْزَانَ﴾ مِیْزَانٌ کے معنی یہاں عدل مروی ہیں۔ (ج) یا شریعت جس سے حقوق کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ (ر) یعنی کتاب تو انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ نے عدل یا ایک اندازہ بھی نازل کیا ہے جس میں اشارہ انسانوں کے محاسبہ کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے آگے ساعۃ کا ذکر آتا ہے، یعنی وہ محاسبہ کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہے۔

2963- ﴿یُمَارُوْنَ﴾ مُمَارَۃٌ کے وہی معنی ہیں جو اِمْتِرَاءٌ کے ہیں۔ یعنی اس بات میں جھگڑنا جس میں شک ہو۔ ﴿فَلَا تُمَارِ فِیْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا﴾ [الکهف: 22:18] ''سو ان کے بارے میں جھگڑا نہ کرو، سوائے (اس کے کہ) ظاہر جھگڑا (ہو)۔'' ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾﴾ [النجم: 12:53] ''تو کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو وہ دیکھتا ہے۔'' (غ)

2964- ﴿حَرْثَ﴾ [دیکھو نمبر: 264] اور یہاں مراد اس سے وہ آبادی یا فائدہ ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

کیا ان کے کوئی شریک ہیں جنہوں نے دین کا کوئی ایسا رستہ ان کے لیے مقرر کر دیا ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔ اور اگر فیصلے کی بات (پہلے سے) نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے درمیان (ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا اور ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾

تو ظالموں کو دیکھے گا (کہ) اس سے ڈر رہے ہیں جو انہوں نے کمایا ہے اور وہ ان پر واقع ہونے والا ہے۔ اور جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں وہ بہشت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑا فضل ہے۔

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

یہ وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ کہہ، میں تم سے اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا، مگر قریبیوں میں باہم محبت (چاہتا ہوں) اور جو کوئی نیکی کرتا ہے ہم اس کے لیے اس میں خوبی بڑھاتے ہیں۔ اللہ بخشنے والا قدردان ہے۔ (2965)

[اُحْرَثْ فِي الدُّنْيَاكَ لِآخِرَتُكَ] یعنی دنیا میں آخرت کی کھیتی تیار کر لے یعنی فائدہ حاصل کر لے۔ (غ)

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں بعض باتوں میں ناکامی بھی ہو سکتی ہے مگر آخرت کی کوئی کوشش ضائع نہیں ہوتی۔

2965- ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ یہاں بعض نے اِلَّا کو استثنائے منقطع قرار دے کر یوں معنی کیے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تم مجھ سے بوجہ قرابت کے (فی گویا سببیت کے لیے ہے) محبت کرو اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ؕ وَ يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَ يُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

کیا کہتے ہیں کہ اللہ پر جھوٹ بنالیا ہے، سو اگر اللہ چاہتا تو تیرے دل پر مہر کر دیتا، اور اللہ جھوٹ کو مٹاتا ہے اور اپنی باتوں سے حق کو ثابت کرتا ہے وہ سینوں کی باتوں سے واقف ہے۔ (2966)

کہ قریش کا کوئی بطن نہ تھا جس میں آپ کا تعلق قرابت نہ ہو۔ گویا اسی تعلق قرابت کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ جس طرح تم اپنے قریبیوں کی حمایت کرتے ہو اور خواہ مخواہ ایذا نہیں دیتے یہی معاملہ مجھ سے کرو۔ اور ایک معنی یوں کئے گئے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ تم میرے قریبیوں سے محبت کرو۔ گویا یہ اہل بیت کی محبت کی تلقین ہے اور اہل بیت کی محبت کے متعلق بعض احادیث بھی ہیں۔ لیکن اگر یہ احادیث صحیح بھی مانی جائیں تو بھی اس بات کی کہ اس آیت کا یہی منشا ہے کوئی سند نہیں۔ ان احادیث کا منشا صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو دکھایا گیا تھا کہ آپ کی امت کے بعض لوگ اہل بیت سے بغض کریں گے۔ اس لیے آپ نے اس سے بچنے کی اور اہل بیت سے محبت کی ہدایت فرمائی۔ اور ان سب معنوں پر یہ اعتراض ہے کہ وعظ پر کسی اجر کا نہ مانگنا سب انبیاء کی عام تعلیم ہے جیسا کہ ہر نبی کے ذکر میں یہ لفظ آتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے ذکر میں بھی یہی لفظ آتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ تو سب انبیاء کے لیے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ہر جگہ یہ فرما کر کہ نبی وعظ کے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا یہاں کوئی اور اصول قائم نہیں کیا جا سکتا۔ پس ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ میں اِلَّا استثنائے منقطع ہے۔ اور اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ جیسا کہ عبداللہ ابن القاسم سے مروی ہے کہ میں تم سے کوئی اجر یا اپنی ذات کے لیے کوئی منفعت نہیں چاہتا۔ اگر چاہتا ہوں تو صرف یہی چاہتا ہوں کہ تم باہم محبت سے رہو۔ یعنی اس میں اتفاق و یگانگت کی تعلیم ہے۔ اور یا جیسا کہ حسن سے مروی ہے قُرْبٰی بجائے قُرْبَةٌ ہے اور مراد قرب الٰہی کا حاصل کرنا ہے یعنی تم سے یہ چاہتا ہوں کہ اعمال صالحہ سے اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کی تڑپ اپنے دلوں میں پیدا کرو۔ (ر) اور ان آخری معنوں پر قرآن کریم کی شہادت ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝﴾ [الفرقان: 57:25] یعنی میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔ اب دونوں جگہ ایک ہی لفظ ہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا اور دونوں جگہ بعد میں اِلَّا آتا ہے جو منقطع ہی ہو سکتا ہے نہ متصل۔ پھر ایک جگہ اِلَّا کے بعد یہ لفظ ہیں کہ جو کوئی چاہے اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے اور دوسری جگہ مودت فی القربیٰ ہے۔ پس یا تو مودت فی القربیٰ سے مراد حصول قرب الٰہی کی تڑپ اور محبت ہی ہے اور دونوں آیتیں ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں اور یا ایک جگہ ﴿اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ کہہ کر حقوق اللہ کی طرف اور دوسری جگہ ﴿الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى﴾ کہہ کر حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی ہے۔

2966- اس بات کا جواب کہ یہ کہتے ہیں جھوٹ افترا کر لیا ہے، یہ دیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تیرے دل پر مہر کر دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ

وَ هُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ یَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور بدیوں کو مٹاتا ہے اور وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

وَ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۲۶﴾

اور ان کی (دعا) قبول کرتا ہے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور انہیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا ہے اور کافروں کے لیے سخت عذاب ہے۔ (2967)

وَ لَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۷﴾

اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق فراخ کر دے تو وہ زمین میں سرکش ہو جائیں لیکن وہ اس اندازہ سے اتارتا ہے جو چاہتا ہے۔ ہاں وہ اپنے بندوں سے خبردار دیکھنے والا ہے۔

جھوٹ افترا کرنے والے کے دل پر تو اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے اگر تم بھی ایسا کرتے تو تمہارے دل پر بھی مہر لگ جاتی اور تمہیں کسی نیکی کی توفیق نہ ملتی۔ بالفاظ دیگر بتایا ہے کہ افترا کرنے والے تو یہ ہیں جن کے دلوں پر ایسی مہر لگی ہوئی ہے کہ انہیں کسی نیکی کی توفیق ملتی ہی نہیں۔ اور آنحضرت ﷺ جو خود نیکی کرتے اور دوسروں کو نیکی کی تعلیم دیتے ہیں وہ ان باتوں سے بہت بلند ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خطاب عام ہو۔ یعنی ﴿یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِكَ﴾ سے مراد کافر کے دل پر مہر کر دینا ہے جو ایسی باتیں کہتا ہے۔ اور مجاہد اور مقاتل سے یہ معنی مروی ہیں کہ تیرے دل پر ایسی صبر کی مہر لگا دے کہ ان کی اذیت والی باتیں تجھے ناگوار نہ گزریں۔ (ر)

2967- استجابۃ کے لیے [دیکھو نمبر: 231] اور ترجمہ میں وہ معنی اختیار کیے گئے ہیں جب استجاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو۔ گویا پہلی آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرتا ہے پھر بدیوں کو معاف کرتا ہے، پھر اعمال صالحہ کرنے والوں کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ اپنے عظیم الشان فضل سے اس سے بھی بڑھ کر دیتا ہے جس قدر وہ مانگتے ہیں۔ اور ﴿یَسْتَجِیْبُ﴾ کا فاعل ﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ بھی ہوسکتا ہے یعنی مومن اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَ یَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَ هُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۸﴾

اور وہی ہے جو بارش اتارتا ہے، اس کے بعد کہ وہ مایوس ہو گئے ہوں اور وہ اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے اور وہ کارساز تعریف کیا گیا ہے۔ (2968)

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَ هُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ ع

اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور جو ان کے اندر اس نے جاندار پھیلائے ہیں۔ اور وہ ان کے جمع کرنے پر جب چاہے قادر ہے۔ (2969)

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِیْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَیْدِیْكُمْ وَ یَعْفُوْا عَنْ كَثِیْرٍ ﴿۳۰﴾

اور جو تم پر مصیبت پڑتی ہے، تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ اور وہ بہت کچھ معاف بھی کر دیتا ہے۔ (2970)

2968- اس میں اشارہ اس رحمت کی طرف معلوم ہوتا ہے جو زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد ﴿رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ کے وجود میں عطا کی گئی۔

2969- **سماوات میں جانداروں کا ہونا:** ﴿دَآبَّةٍ﴾ کے آسمان اور زمین دونوں میں ہونے پر مفسرین کو دقت پیش آئی ہے اور کبھی اسے ملائکہ پر لگایا گیا ہے اور کبھی مراد مطلق حیّ لیے گئے ہیں۔ حالانکہ ﴿دَآبَّةٍ﴾ بالخصوص چلنے والے پر بولا جاتا ہے اور ملائکہ جو غیر مرئی لطیف ہستیاں ہیں ان پر یہ لفظ صادق نہیں آ سکتا۔ لیکن اس میں کیا بُعد ہے کہ آسمانوں میں جو اجرام، سیارے وغیرہ ہیں ان میں ویسے جاندار موجود ہوں جیسے اس زمین پر چلتے ہیں، بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیگر کرہ ہائے سماوی جانداروں سے خالی نہیں۔

2970- **ترقی درجات کے لیے مصائب:** مفسرین نے بعض احادیث اس آیت کی تفسیر میں بیان کی ہیں کہ جو کوئی تکلیف یا بیماری وغیرہ آتی ہے تو وہ کسی گناہ کی وجہ سے آتی ہے۔ مگر ان احادیث کے صریحاً خلاف یہ آیت قرآنی ہے: ﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ﴾ [البقرة: 155:2] ''اور ضرور ہم کسی قدر ڈر اور بھوک سے تمہارا امتحان کریں گے۔'' جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو محض ان کی ترقی درجات کے لیے بھی تکالیف میں ڈالتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: [مَنْ أَشَدُّ النَّاسِ بَلَآءً؟ قَالَ: النَّبِیُّونَ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ] (السنن الکبری للبیهقي، کتاب الجنائز، باب مَا یَنْبَغِي لِکُلِّ مُسْلِمٍ أَنْ یَسْتَشْعِرَهُ مِنَ الصَّبْرِ عَلَی جَمِیعِ مَا یُصِیبَهُ مِنَ الْأَمْرَاضِ وَالْأَوْجَاعِ وَالْأَحْزَانِ لِمَا فِیهَا مِنَ الْکَفَّارَاتِ وَالدَّرَجَاتِ: 6772) سخت تر مصائب کے اٹھانے میں نبی ہیں پھر جیسے جیسے اعلیٰ درجے کے لوگ ہوں گے ویسی ہی ان کی

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾

اور تم زمین میں (اللہ کو) عاجز کرنے والے نہیں، اور تمہارے لیے اللہ کے سوائے کوئی کارساز نہیں اور نہ کوئی مددگار ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے سمندر میں پہاڑوں جیسی کشتیاں ہیں۔ (2971)

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾

اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے سو وہ اس کی پیٹھ پر کھڑی رہ جائیں۔ یقیناً اس میں ہر ایک صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے نشان ہیں۔ (2972)

تکالیف بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ اور بچوں پر جو تکالیف آتی ہیں وہ ان کے لیے ترقی درجات کا موجب ہونے کے علاوہ ان کے والدین کے لیے بھی ترقی درجات کا موجب ہوتی ہیں۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جس کے چھوٹے بچے مر جائیں وہ والدین کے لیے بہشت میں جانے کا موجب ہوتے ہیں۔ اور یہاں جو ذکر ہے وہ کفار کا ذکر ہے جو ابطال حق کرنا چاہتے تھے اور اپنا سارا زور حق کے نیست و نابود کرنے کے لیے صرف کر رہے تھے، انہیں بتایا کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچے گی وہ تمہاری انہی کرتوتوں کی وجہ سے پہنچے گی اور پھر بھی تمہارے سارے اعمال کی سزا تمہیں نہیں ملے گی، اللہ تعالیٰ بہت کچھ تمہاری زیادتیوں کو معاف بھی کر دے گا۔ اور یہی اس عفو کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے دکھایا اور ان کی ساری زیادتیوں پر عفو کی قلم پھیر دی۔ اور یہ بات کہ یہاں مخالفین کی سزا کا ذکر ہے اگلی آیت سے ظاہر ہے کہ تم خدا کی سزا سے بھاگ نہیں سکتے اور تمہارا کوئی مددگار بھی نہیں ہوگا۔ دونوں آیتوں میں ایک ہی خطاب ہے۔

2971- ﴿الْجَوَارِ﴾ واحد اَلْجَارِيَةٌ ہے جس کے معنی کشتی ہیں جو سمندر میں چلتی ہے۔ (جری سے) ﴿حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ [الحاقة: 11:69] ''ہم نے تمہیں کشتی پر سوار کیا۔'' (غ)

﴿كَالْاَعْلَامِ﴾ اَعْلَامٌ۔ عَلَمٌ کی جمع ہے جو اصل میں نشان ہے۔ جس سے کوئی چیز جانی جائے جیسے لشکر کا علم یا رستے کا عَلَمٌ اور اسی لیے پہاڑ کو بھی عَلَمٌ کہا جاتا ہے۔ (غ)

2972- ﴿رَوَاكِدَ﴾ رَكَدَ پانی اور ہوا کے ٹھہر جانے پر بولا جاتا ہے اور ایسا ہی کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی۔ (غ)

کشتیوں کا سمندر میں چلنا اللہ تعالیٰ کے فضل کے نشانات میں سے ہے۔ مگر یہاں اس بیان میں خاص اشارہ کفار کی حالت کی

اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ يَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾

یا انہیں اس کی وجہ سے جو انہوں نے کمایا تباہ کر دے اور وہ بہت کچھ معاف کرتا ہے۔

وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

اور (تاکہ) وہ جان لیں، جو ہماری آیتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں۔ (2973)

فَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ۚ

تو جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے، اور جو کچھ اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ (2974)

وَ الَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ وَ اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ۚ

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں اور جب غصے میں آئیں تو معاف کر دیتے ہیں۔

طرف ہے کہ وہ کتنے ہی طاقتور ہوں لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کی طاقت کا خاتمہ کر دے اور وہ دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں۔ اسی لیے آیت کے اخیر پر ﴿صَبَّارٍ شَكُوْرٍ﴾ کے لفظ آئے ہیں۔

2973- ﴿يَعْلَمَ﴾ پر نصب ہے گویا پہلے کوئی ایسے الفاظ مقدر ہیں جیسے [لِيَنْتَقِمَ مِنْهُمْ] یعنی تاکہ انہیں سزا دے اور تاکہ وہ جان لیں۔ اور پچھلی آیات میں چونکہ اس کا ذکر صاف ہے اس لیے ایسا مقدر ماننے میں ہرج کوئی نہیں۔

2974- یہاں بھی خطاب کفار کو ہی خاص معلوم ہوتا ہے، جو اپنی ظاہری طاقت کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں بتایا ہے کہ یہ طاقت باقی رہنے والی چیز نہیں، چند روزہ سامان ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۪ وَ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ۪ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۸﴾

اور جولوگ اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے اور اس سے جو ہم نے انہیں دیا خرچ کرتے ہیں۔ (2975)

وَ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾

اور وہ کہ جب ان پر زیادتی ہوتو وہ بدلہ لیتے ہیں۔

وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾

اور بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ (2976)

2975- اسلام کی جو کچھ تعلیم ہے شروع سے ایک ہی ہے۔ یہ مکی سورت ہے اور یہاں بھی شوریٰ یعنی **مشورہ کا حکم** موجود ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس سورت یا آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کے کوئی اہم کام ایسے نہ تھے جن میں شوریٰ کے حکم کی حاجت ہو، کیونکہ مشورہ قومی کاموں میں ہوتا ہے۔ اور قومی کام زیادہ تر حکومت کے متعلق ہی ہوتے ہیں۔ پس یہاں ﴿ اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ ﴾ میں گویا بتا بھی دیا ہے کہ مسلمانوں کو حکومت بھی ملے گی اور ان کی حکومت کی بنیاد مشورہ پر ہونی چاہئے۔ اور نماز اور انفاق کے درمیان اس حکم کو لا کر اس کی اہمیت بتا دی ہے اور احادیث بھی مشورہ کے متعلق صریح ہیں۔ ایک حدیث میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے بعد کوئی اہم امر پیش آئے جس میں قرآن کریم کی کوئی نص صریح نہیں نہ آپ کا کوئی فیصلہ ہے۔ تو فرمایا کہ میری امت کے نیک لوگوں کو جمع کرو اور مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو اور اکیلے کی رائے سے فیصلہ نہ کرو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ عاقل ہو۔ (ر) اس آیت کے صریح حکم سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی **حکومت کی بنیاد صرف مشورے پر** ہے، اور پارلیمنٹ اصل اسلامی قانون ہے جس کا حکم سوائے اسلام کے اور کسی مذہب کی کتاب میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمان قوم کی تربیت جن اصول پر ہوئی ان میں سے تین عظیم الشان اصول یہاں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی نماز یا اللہ تعالیٰ کے حضور جھکے رہنا اور اصلاح نفس اور انفاق فی سبیل اللہ یا اپنی قوتوں اور اپنے مال و دولت کو مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا اور شوریٰ یعنی امور قومی کو باہمی مشورہ سے طے کرنا۔ اس سے بہتر قوم کی رہنمائی کے لیے کوئی اصول نہیں ہو سکتے۔

2976- تمام **تعزیرات کا خلاصہ** اس ایک آیت میں آجاتا ہے۔ بلکہ اس سے بہت کچھ بڑھ کر تعزیرات کا اصل منشا لوگوں کو دوسروں پر

وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۱﴾

اور جو کوئی اپنے (اوپر) ظلم کے بعد بدلہ لیتا ہے تو ان لوگوں پر (الزام کا) رستہ نہیں۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾

(الزام کا) رستہ صرف ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتی کرتے ہیں۔ انہی کے لیے دردناک دکھ ہے۔

وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾ ع 4 14 5

اور جو کوئی صبر کرے اور معاف کرے تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

ظلم اور زیادتی سے روکنا ہے اور اس کے لیے کچھ سزائیں تجویز کی ہیں۔ ان سب سزاؤں کا خلاصہ یہاں چار لفظوں میں ہے۔ بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ یہی تمام سزاؤں کی اصل بنیاد ہے سوائے قتل، زنا اور ڈاکہ چوری کے۔ مگر ان میں بھی ایک حد تک امام کی رائے پر معاملہ کو چھوڑا ہے۔ باقی تمام سزاؤں کے لیے ایک اصول بتا دیا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر بغیر سزا دینے کے اصلاح ہو جائے جو تعزیرات کی اصل غرض ہے تو معاف کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ عَفَا کے ساتھ اَصْلَحَ کا لفظ بڑھایا ہے یعنی معافی اس صورت میں ہو جب اس کا نتیجہ اصلاح ہو۔

طاقت کے وقت عفو:

یہ آیت بھی ایک پیشگوئی کے رنگ میں ہے۔ اور اس میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کو اس قدر طاقت ملے گی کہ اپنے مخالفوں کو سزا دینے کا اختیار رکھتے ہوں گے۔ اس وقت بھی عفو کو مدنظر رکھنے کی ضرورت بتائی ہے۔ غربت اور مسکینی کی حالت میں جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور آپ کے حواریوں کو پیش آئی۔ صبر اور عفو آسان باتیں ہیں لیکن جب ظالموں پر تسلط حاصل ہو اور ظلم کرنے والے حاکم محکوم بن جائیں اس وقت عفو دکھانا بڑا کام ہے۔ یہی وہ بات ہے جس کا نمونہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا پیش کیا جس کی کوئی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ اسی لیے رکوع کی آخری آیت میں فرمایا ﴿صَبَرَ وَ غَفَرَ﴾۔ ﴿عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ میں سے یہ ہے کہ مصیبت کے وقت صبر کرے، طاقت کے وقت معاف کرے۔

اور یہ جو بدی کے بدلہ کو ﴿سَيِّئَةٌ﴾ کہا ہے تو یہ اسی کے مطابق ہے جو [نمبر: 27] میں بیان ہوا اور اس میں **فلسفۂ سزا** کی طرف اشارہ ہے کہ سزا بھی کسی کو تکلیف پہنچانا ہے مگر یہ ظلم کو روکنے کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۴﴾

اور جسے اللہ گمراہ قرار دے تو اس کے لیے اس کے بعد کوئی کارساز نہیں اور تو ظالموں کو دیکھے گا جب وہ عذاب کو دیکھیں گے کہیں گے کیا کوئی رستہ لوٹنے کا بھی ہے؟

وَ تَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾

اور تو انہیں دیکھے گا اس پر لائے جائیں گے تو ذلت کی وجہ سے عاجزی اختیار کر رہے ہوں گے (اور) چھپی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے اور جو ایمان لائے وہ کہتے ہیں نقصان اٹھانے والے وہی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن نقصان میں رکھا۔ سنو! ظالم قائم رہنے والے عذاب میں رہیں گے۔ (2977)

وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ﴿۴۶﴾

اور اللہ کے سوائے ان کے کوئی حمایتی نہ ہوں گے، جو ان کی مدد کریں۔ اور جسے اللہ گمراہ قرار دے تو اس کے لیے کوئی بھی رستہ نہیں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾

اپنے رب کی فرمانبرداری کرو اس سے پہلے کہ اللہ کی طرف سے وہ دن آجائے جس کے لیے ٹلنا نہیں۔ تمہارے لیے اس دن کوئی پناہ نہیں اور نہ تمہارے لیے انکار کرنا ہے۔

2977- ﴿خَفِيٍّ﴾ کے معنی مخفی ہیں اور یہاں مراد ضعیف یعنی کمزور ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے معنی ذلیل کیے ہیں۔ (ر)
یہاں جو نقشہ عذاب کا کھینچا ہے وہ قیامت پر بھی صادق آتا ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر صفائی سے ان کی اس حالت پر صادق آتا ہے جو اس دنیا میں انہیں پیش آئی۔ ذلت کی وجہ سے عاجزی اختیار کرنا اور کمزور نگاہ سے دیکھنا ان کی وہ حالت ہے جو فتح مکہ میں ظہور میں آئی۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

سو اگر وہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تجھے ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ تجھ پر صرف (بات کا) پہنچا دینا ہے۔ اور ہم جب انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر انہیں کوئی برائی پہنچے اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے تو انسان ناشکر گزار (ہو جاتا) ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾

اللہ کے لیے ہی آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے۔ (2978)

2978- ﴿اِنَاثًا﴾ اِنَاثٌ۔ ﴿الذُّكُوْرَ﴾ ذُكُوْرٌ۔ اِنَاثٌ۔ اُنْثٰی کی جمع ہے اور ذُكُوْرٌ اور ذُكْرَانٌ ذَكَرٌ کی۔ اور ذَكَرٌ اور اُنْثٰی ایک دوسرے کی ضد ہیں یعنی نر اور مادہ ﴿وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی﴾ [النسآء: 124:4] ''اور جو نیک کام کرے مرد ہو یا عورت۔'' اور چونکہ ہر نوع حیوانی میں مادہ بہ نسبت نر کے کمزور ہوتی ہے اس لیے اُنْثٰی اس کو بھی کہتے ہیں جس کا عمل کمزور ہو۔ (غ)

اوپر کفار کی سزا کا ذکر تھا اور آگے اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے کلام کا ذکر ہے۔ اور درمیان میں ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کے کسی کو لڑکیاں اور کسی کو لڑکے دینے کا ذکر ہے۔ ان آیات کا باہم تعلق کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ منکرین کی سزا میں ایک قوم کو مٹانے کا اور وحی الٰہی سے دوسری قوم کو زندہ کرنے کا اشارہ ہے گویا اللہ تعالیٰ ایک قوم کو مٹاتا اور ایک کو خلق کرتا ہے۔ اس پر فرمایا: ﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ یعنی وہ اختیار رکھتا ہے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ لفظ اِنَاثٌ میں اشارہ کمزور عملوں والوں کی طرف ہو اور ﴿عَقِيْمٌ﴾ میں یہ اشارہ ہو کہ ایک نسل کا خاتمہ کر دیا جائے اور اس کی آگے ترقی کا سامان بند کر دیا جائے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِنَاثٌ اور ذُكُوْرٌ کے دینے میں اشارہ ایک قوم کی تکثیر کی طرف ہو۔ اور ﴿عَقِيْمٌ﴾ میں دوسری قوم کی ہلاکت کی طرف اور آگے ﴿عَلِيْمٌ﴾ اور ﴿قَدِيْرٌ﴾ کی صفات میں بھی اسی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ اور قرآن کریم میں یہ بسا اوقات ہوتا ہے کہ ایک ظاہری نظارہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور اس کے نیچے ایک اور غرض بھی ہوتی ہے۔ اور روح المعانی میں ہے کہ اِنَاثٌ کو پہلے اس لیے رکھا کہ وہ تکثیر نسل کا موجب ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عورتوں کی جو تحقیر ملک عرب میں اور عام طور پر دنیا

اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝۵۰

یا وہ انہیں ملا دیتا ہے (کچھ) لڑکے اور (کچھ) لڑکیاں، اور جسے چاہتا ہے بانجھ بناتا ہے۔ وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝۵۱

اور کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی سے یا پردے کے پیچھے سے یا رسول بھیجے۔ پس اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے۔ وہ بڑا بلند حکمت والا ہے۔ (2979)

میں کی گئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے اناث کا ذکر پہلے کیا اور یوں گویا **عورت کے مقام بلند** کی طرف توجہ دلائی۔ اور اگر غور کیا جائے تو اولاد کی پرورش اگر ایک بڑا بھاری فریضۂ انسانی ہے جس سے انسان نسل انسانی کی خدمت کا سبق سیکھتا ہے اور اس کے اندر اپنے آرام کو دوسروں کے آرام پر قربان کرنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ غرض لڑکیوں کی پرورش سے بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے لڑکوں کی پرورش میں انسان کو کچھ اپنے نام اور کچھ اپنے آرام کا خیال بھی ہوتا ہے لیکن **لڑکیوں کی پرورش بے غرض ربوبیت** کا ایک نمونہ ہے کہ ایک انسان ان کی پرورش کر کے جب وہ کام کاج کے قابل ہوتی ہیں تو انہیں دوسرے کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ پالنے والے کے لیے نام کے بقا یا آرام کا موجب نہیں ہوتیں۔

2979- **وحی کی اقسام:** ﴿وَحْيًا﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 768] امام راغب نے ایک عام وحی بیان کی ہے جس کا ذکر ان کے نزدیک اس آیت میں ہے: ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ﴾ [الأنبیآء: 25:21] ''اور تجھ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف ہم (یہی) وحی کرتے تھے۔'' تو وہ کہتے ہیں یہ وحی اپنے سب انواع میں عام ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی معرفت اور اس کی عبادت کے وجوب کی معرفت اس وحی تک محدود نہیں جو اولوالعزم رسولوں سے خاص ہے بلکہ یہ چیزیں عقل اور الہام سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ جس طرح سماعت سے پہچانی جاتی ہیں۔ (غ) اور آیت زیر بحث میں جن وحیوں کا ذکر ہے وہ ایک تو رسول کے ذریعہ سے ہے جسے دیکھا جاتا ہے اور جس کی بات سنی جاتی ہے جیسا جبریل علیہ السلام کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صورت معین میں کلام پہنچانا اور دوسری کلام کا سننا درآنحالیکہ کلام کرنے والا نہ دیکھا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا اور تیسری قسم میں ایک [اَلْقَاءَ فِي الرَّوْعِ] ہے یعنی دل کے اندر ایک بات کا ڈالنا۔ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی اور ایک الہام ہے جیسے ﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ [القصص: 7:28] ''اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلا۔'' یا تسخیر جیسے ﴿وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾

وَ كَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَ لَا الۡاِيۡمَانُ وَ لٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهۡدِىۡۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے روح بھیجی، تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ (یہ کہ اس پر) ایمان (کیا ہے)؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا۔ اس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اور تُو یقیناً سیدھے رستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ (2980)

[النحل: 68:16] ''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔'' اور ایک خواب کے ذریعے سے جیسے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَبَقِیَّتُ الْمُبَشِّرَاتُ] جس میں مومن کا رؤیا شامل ہے۔ پس الہام اور تسخیر اور رؤیا پر لفظ ﴿وَحْیًا﴾ دلیل ہے اور سماع کلام بغیر معائنہ پر ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ اور جبریل علیہ السلام کے صورت معینہ میں پہنچانے پر ﴿یُرْسِلَ رَسُوْلًا﴾ (غ)۔

میرے نزدیک مفسرین نے جو استثنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے کیا ہے وہ صراحت قرآنی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اِنَّاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ كَمَاۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ﴾ [النسآء: 163:4] ''بے شک ہم نے تیری طرف وحی کی، جیسے ہم نے نوح علیہ السلام اور اس سے پچھلے نبیوں کی طرف وحی کی۔'' اور انہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ تمام انبیاء کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی علیحدہ پیرایہ میں کلام کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون عام ہے۔ انبیاء کے مکالمہ میں بھی ایک حصہ تو وہ ہے جو ان کی وحی متلو کہلاتی ہے اور یہ جبریل علیہ السلام صورت معینہ میں پہنچاتے ہیں۔ اور دوسرا وہ جو بذریعہ کشف ان پر وارد ہوتا ہے۔ یا جو کلام بغیر کلام کرنے والے کے دیکھنے کے سنا جاتا ہے، جو اولیاء اللہ میں الہام کہلاتا ہے۔ اور تیسرا وہ جو بذریعہ وحی خفی ان کے دل میں ڈالا جاتا ہے س پر بعض وقت الہام کا لفظ بھی بول دیا جاتا ہے اور یہ وحی غیر متلو ہے۔ صورت اول ﴿اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا﴾ والی ہے اور یہ انبیاء سے مخصوص ہے۔ اسی لیے اب بعد خاتم النبیین ﷺ جبریل علیہ السلام کا وحیٔ نبوت لے کر آنا موقوف ہے۔ گو وہ مومنوں کی تائیدات کے لیے آتا ہے۔ اور دوسری صورت ﴿مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ﴾ ہے اور تیسری صورت ﴿وَحْیًا﴾ اور ان پچھلی دونوں صورتوں میں اولیاء اور انبیاء دونوں شامل ہیں۔ اور اسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ یا حضرت مریم علیہا السلام یا حواری آتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا۔ باقی رہی نحل کی طرف وحی یا زمین یا آسمان کی طرف وحی، تو یہ انسانوں کے ساتھ کلام سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔

2980 - **وحی الٰہی سے زندگی:** یہاں قرآن کو روح یا زندگی کہہ کر بتا دیا کہ اسی سے آئندہ قوموں کو زندگی ملے گی اور اس لیے وہی قوم زندہ ہوگی جو اس کی حامل ہے اور یوں جہاں مخالفت کرنے والوں کی ہلاکت کا ذکر کیا، مومنوں کو زندگی کی بشارت دی۔

صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِلَی اللّٰهِ تَصِیۡرُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۵۳﴾ ع

اس اللہ کا رستہ جس کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ سنو! اللہ کی طرف ہی سب باتیں انجام کار لوٹتی ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا قبل از بعثت کتاب اور اس پر ایمان کو نہ جاننا:

یہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ مگر آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ پر ایمان تو پہلے بھی رکھتے تھے، بلکہ عبادت کے لیے غار حرا میں جایا کرتے تھے اور بتوں سے متنفر تھے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل تھے۔ اور یہ کہنا کہ آپ ایمان سے خالی تھے کفر ہے۔ پس ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ اگر سیاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں دوسروں کو زندگی دینے کا ذکر ہے اور یہ زندگی بذریعہ قرآن اور اس پر ایمان کے آپ نے پیدا کی۔ تو یہ بات صحیح ہے کہ جب قبل از بعثت آپ پر وحی ہی نہ ہوئی تھی تو اس وحی پر ایمان کے ذریعے سے جو انقلاب دنیا میں پیدا ہونے والا تھا اور جو زندگی قوموں کو ملنے والی تھی اس کا آپ کو کیا علم ہو سکتا تھا۔

پس معنی صاف ہیں۔ ہم نے روح یعنی قرآن کو جو قوموں کے لیے زندگی ہے تیری طرف وحی کیا۔ اس پر ایمان لا کر قوموں میں زندگی پیدا ہوگی۔ قبل از بعثت نہ رسول اللہ ﷺ کو اس قرآن کی خبر تھی کہ اس پر ایمان سے کیا انقلاب ظہور میں آئے گا۔ اسی لیے آگے فرمایا: ﴿وَ لٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ۙ﴿۵۲﴾﴾۔ بلاشبہ پہلے آپ نہ جانتے تھے کہ یہ لوگ کس طرح ان ظلمتوں سے باہر نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک نور دے دیا، اس نور کے ذریعہ سے آپ نے لوگوں کو صراط مستقیم پر چلایا۔

سورۃ الزخرف

نام:

اس سورت کا نام الزُّخۡرُفِ ہے اور اس میں 7 رکوع اور 89 آیتیں ہیں۔ زُخۡرُفٌ کے معنی سونا ہیں اور اس سورت میں بتایا ہے کہ لوگ عموماً دنیوی آرائش کے ظاہری سامانوں پر فریفتہ رہتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیزیں یعنی چاندی سونا وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کچھ حقیقت نہیں رکھتیں اور وہ محض اپنے رحم بے پایاں سے رسول کو بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو بدی کے بدانجام سے ڈرائے۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باوجود ایک قوم کے حد اسراف کو پہنچ جانے کے انہیں بھلا یا نہیں بلکہ ان میں ایک علم و حکمت کی کتاب دے کر ایک رسول کو بھیجا کہ شرک کی بیخ کنی کرے۔

② دوسرے رکوع میں شرک کی تردید کی ہے اور بتایا کہ شرک پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی۔

③ تیسرے رکوع میں بتایا کہ لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی مالدار آدمی رسول ہو۔ کیونکہ ان کی نظروں میں مال کی وقعت بہت ہوتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں مال دنیا کچھ حقیقت نہیں رکھتا اور رسول کا انتخاب اَور درجات کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

④ چوتھے میں مخالفت رسول پر سزا کا ذکر کیا۔

⑤ پانچویں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم فرعون کی مثال سے اسے واضح کیا۔

⑥ چھٹے میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا بنی اسرائیل کے لیے قیامت وسطیٰ کا قائم ہونا تھا۔ اور سمجھایا کہ ایک برگزیدہ قوم بھی جب خدا کے رسول کی مخالفت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گر جاتی ہے۔

⑦ ساتویں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والوں کو توجہ دلائی کہ ان کے لیے دنیا میں بھی ناکامی ہے اور آخرت میں بھی عذاب ہے۔

تعلق:

جب پچھلی سورت میں یہ بتایا کہ پیغام اسلام کل عالم کے لیے تو یہاں بتایا کہ مذہب لوگوں کے اخلاق کی درستگی کے لیے آتا ہے، دنیوی سامانوں سے متمتع کرنا اس کی کوئی غرض نہیں۔ عیسائی اقوام کو اپنی دنیوی زیب وزینت پر بہت فخر ہے۔ حالانکہ مذہب کی غرض اخلاقی زیب وزینت کا جامہ پہنانا ہے۔ انہی کی طرف زخرف کے ذکر میں خاص اشارہ ہے اور آخری دو رکوعوں میں

اٰيَاتُهَا 89 (43) سُوْرَةُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ (63) رُكُوْعَاتُهَا 7

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ﴿۱﴾ — (اللہ) بے انتہا رحم والا (ہے)۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ — کھول کر بیان کرنے والی کتاب گواہ ہے۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۳﴾ — کہ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا، تاکہ تم سمجھو۔

وَ اِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۴﴾ — اور وہ ہمارے پاس ام الکتاب میں بلند مرتبہ حکمت والا ہے۔(2981)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اور عقیدۂ ابنیت کی تردید ہے۔

2981- ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [دیکھو نمبر: 375] محکمات یا اصول کو کہا ہے اور فاتحہ کو ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ کہا ہے۔ اس لیے کہ وہ کتاب کا مبدا یعنی آغاز ہے۔ (غ) یا اس لیے کہ ہر نماز میں پہلے اسی کو پڑھا جاتا ہے۔ (ل) زجاج کہتے ہیں ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ [اَصْلُ الْكِتَابِ] یعنی کتاب کا اصل ہے اور کہا گیا ہے کہ لوح محفوظ۔ اور تہذیب میں ہے کہ شرائع اور احکام اور فرائض کی آیات میں سے ہر ایک محکم آیت ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ ہے اور حدیث میں آیا ہے کہ ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ فاتحہ ہی ہے کیونکہ وہ تمام نمازوں میں ہر سورت سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ مصحف کی ابتدا ہوتی ہے اور یہاں ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ لوح محفوظ کو کہا ہے۔ اور قتادہ کہتے ہیں اصل کتاب ہے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ قرآن ہے، اول سے لے کر آخر تک۔ (ل) اور یہی دو قول اس کے معنی میں ابن جریر نے نقل کیے ہیں۔ یعنی لوح محفوظ اور [اَصْلُ الْكِتَابِ وَ جُمْلَتِهٖ] (ج) اور لوح محفوظ سب کتاب سماوی کے لیے بطور اُمّ ہے یعنی ان کا اصل اور ﴿اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد علم ازلی اور آیات محکمات بھی لی گئی ہیں۔ (ر)

﴿لَدَى﴾ لَدَى اور لَدُنْ قریب قریب ہیں اور لَدُنْ عِنْدَ سے خاص ہے کیونکہ وہ نہایت فعل پر دلالت کرتا ہے اور بعض وقت عِنْدَ کی جگہ ہی استعمال ہوتا ہے۔ ﴿قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا﴾ [الکھف: 76:18] ''تو میری طرف سے عذر (کی حد) کو پہنچ چکا۔'' ﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ [آل عمران: 8:3] ''اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما۔'' ﴿وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا

اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ ۝۵

تو کیا ہم تم سے اعراض کرتے ہوئے نصیحت کو پھیر دیں گے۔اس لیے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔ (2982)

وَ کَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِیٍّ فِی الۡاَوَّلِیۡنَ ۝۶

اور کتنے ہی نبی ہم نے پہلوں میں بھیجے۔

وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ۝۷

اور کوئی نبی ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر وہ اس سے ہنسی کرتے تھے۔

الۡبَابِ﴾[یوسف: 25:12] ''اور دونوں نے اس کے خاوند کو دروازے پر پایا۔''(غ)

قرآن کا علو وحکمت:

ان آیات میں کتاب مبین کی قسم کھا کر اس کتاب کو بطور شہادت اس بات پر پیش کیا ہے کہ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے یعنی وضاحت سے بیان کرنے والا[دیکھو نمبر: 1516] اور کہ وہ ﴿عَلِیٌّ﴾ اور ﴿حَکِیۡمٌ﴾ ہے۔عَلِیٌّ کے لیے[دیکھو نمبر: 1603] اور مراد اس کا سب کتب پر بلند ہونا اور وجوہ فساد سے بلند ہونا ہے اور حَکِیۡمٌ سے مراد سب کتب پر حاکم ہونا یا محکم ہونا ہے۔ (ح) یا حَکِیۡمٌ سے مراد ہے کہ اس میں حکمت اور علم کی باتیں ہیں۔تو مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کی بلند مرتبگی اور اس کے پُر حکمت ہونے پر خود قرآن ہی گواہ ہے اور اس کی شہادت یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو بلند مرتبہ اور حکیم بنا کر دکھا دے کیونکہ اس کا دعویٰ یہی ہے کہ اس کی تعلیم علو اور حکمت کے مقام پر پہنچاتی ہے اور ﴿اُمُّ الۡکِتٰبِ﴾ کے جو بھی معنی کیے جائیں مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور علم الٰہی ضائع نہیں ہوسکتا، بلکہ دشمن اسے تباہ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے مقابل میں اس کے علو اور اس کے پُر حکمت ہونے کا ذکر کیا۔

2982- ﴿اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ﴾ نَضۡرِبُ عَنۡکُمُ۔[اَلضَّرۡبُ یَقَعُ عَلٰی جَمِیۡعِ الۡاَعۡمَالِ اِلَّا قَلِیۡلًا]۔ضرب کا لفظ سب کاموں پر استعمال ہوجاتا ہے سوائے تھوڑوں کے اور [اَضۡرِبَتۡ عَنِ الشَّیۡءُ] کے معنی ہیں اس سے رک گیا اور اعراض کیا۔اور [ضَرَبَ عَنۡہُ الذِّکۡرَ] اور [اَضۡرَبَ عَنۡہُ] دونوں کے معنی ہیں صَرَفَہٗ اسے پھیر دیا اور یہاں معنی ہیں کہ کیا ہم تم کو یوں ہی چھوڑ دیں۔اور تمہیں اس بات کا علم نہ دیں جو تم پر واجب ہے اس لیے کہ تم زیادتی کرتے ہو۔اور [ضُرِبَتۡ عَنۡہُ الذِّکۡرَ] کا محاورہ سوار سے لیا گیا ہے جب وہ جانور پر سوار ہو۔پھر اسے ایک طرف سے پھیرنا چاہے۔تو اسے مارتا ہے تا کہ اسے دوسری طرف پھیر دے۔اور یوں ضَرَبَ بمعنی صَرَفَ ہوگیا ہے اور [ضُرِبَتۡ فُلَانًا عَنۡ فُلَانٍ] کے معنی ہیں اسے اس سے روک دیا۔(ل)

﴿صَفۡحًا﴾ صَفۡحٌ کے معنی جَنب یا پہلو ہیں اور ہر چیز کا صَفۡحٌ اس کی جانب ہے۔اسی سے مُصَافِحَۃٌ یعنی ایک شخص کا اپنی ہتھیلی کی

فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۸

سو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا جو قوت میں ان سے زیادہ سخت تھے اور پہلوں کی مثال گزر چکی۔ (2983)

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝۹ۙ

اور اگر تو ان سے سوال کرے کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ تو ضرور کہیں گے کہ انہیں غالب علم والے نے پیدا کیا۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰ۙ

جس نے تمہارے لیے زمین کو جائے آرام بنایا اور تمہارے لیے اس میں رستے بنائے تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

جانب کو دوسرے کی ہتھیلی کی جانب میں رکھ دینا اور [صَفَحَ عَنْهُ] کے معنی ہیں اس کے گناہ سے اعراض کیا۔ [وَ اَصْلُهُ مِنَ الْاِعْرَاضِ بِصَفِحَةُ وَجْهُهُ] گویا اس کے گناہ سے اپنا منہ پھیر لیا اور یہاں صَفْحٌ سے مراد صرف اعراض ہے کیونکہ [صَفَحَ عَنِّيْ فُلَانٌ] کے معنی ہیں اس سے پیٹھ پھیرتے ہوئے اعراض کیا۔ (ل) اور ﴿صَفْحًا﴾ یہاں صَافِحِيْنَ کی جگہ ہے یا ضرب کے لیے غیر لفظ سے مصدر ہے۔

انسان کی خطا کاری پر اللہ کا رحم:

آیت کا مطلب یہی ہے کہ ایک قوم اگر خطا کاری میں حد سے گزر گئی ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ بھی اسے اسی اسراف کی حالت میں چھوڑ دے اور ان کو نصیحت نہ کرے۔ بالفاظ دیگر کوئی قوم کتنی بھی خطا کاری میں بڑھ جائے اللہ تعالیٰ کا رحم اس کی دستگیری کے لیے بھی تیار ہے۔ ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: 53:39] ''اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔'' مگر مفسرین نے یوں بھی معنی کیے ہیں کہ کیا ہم تمہارے گناہوں سے درگزر کرتے ہوئے عذاب کو تم سے پھیر دیں گے۔ گویا ذکر سے مراد ذکر عذاب ہے۔ اور پہلے معنی بلحاظ سیاق بھی زیادہ موزوں ہیں۔ اس لیے کہ آگے یہی ذکر چلتا ہے کہ پہلے لوگوں میں بھی ہم نبی بھیجتے رہے اور وحی کا نزول صفت رحمانیت کا تقاضا ہے جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں اشارہ ہے۔

2983- ﴿مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ سے مراد ان کا ذکر ہے جو ایک مثل کے حکم میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں درمیانی زمانہ کی ہیں اور ان سے پہلے ایسی سورتیں نازل ہو چکی تھیں جن میں انبیاء اور ان کے مکذبین کا ذکر ہے۔

وَ الَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور وہ جس نے بادل سے پانی ایک اندازے سے اتارا پھر ہم اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کرتے ہیں۔ اسی طرح تم (زندہ کرکے) نکالے جاؤ گے۔

وَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا وَ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَ الْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ﴿۱۲﴾ۙ

اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمہارے لیے کشتیاں اور چارپائے بنائے جن پر تم سوار ہوتے ہو۔

لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَ تَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ۙ

تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر سوار ہو، پھر اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو جب اس پر قرار پکڑو اور کہو، وہ پاک ذات ہے جس نے ہمارے لیے اسے کام میں لگایا اور ہم اسے قابو میں رکھنے والے نہ تھے۔ (2984)

وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور ضرور ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

2984- ﴿عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ ضمیر مذکر کو بعض نے ﴿مَا تَرْكَبُوْنَ﴾ کی طرف لیا ہے اور لفظ انعام مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی۔ ایک جگہ ہے ﴿مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ﴾ [النحل: 66:16] ''اس چیز سے جو ان کے پیٹوں میں ہے۔'' اور دوسری جگہ ﴿مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا﴾ [المؤمنون: 21:23] ''اس سے جو ان کے پیٹوں میں ہے۔'' اور یہاں ضمیر واحد رکھی گئی ہے کیونکہ یہ بمنزلہ جمع ہے۔ (ج)

﴿مُّقْرَنِیْنَ﴾ قَرْنٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 658] وغیرہ اور [اَقْرَنْتُ لِلشَّیْءِ] کے معنی ہیں مجھے اس پر طاقت یا قوت حاصل ہے۔ پس مُقْرِنٌ طاقت رکھنے والا ہے اور اِقْرَانٌ ایک شخص کا دوسرے پر قوت رکھنا ہے۔ (ل)

اس اور اگلی آیت کی مذکورہ دعا ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَ مَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ﴿۱۳﴾ۙ وَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۴﴾﴾ جانور پر سواری کے وقت پڑھی جاتی ہے اور دونوں آیتوں میں تعلق یہ ہے کہ جانور پر سواری جسمانی طور پر سیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانا روحانی سیر ہے۔

وَ جَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ع 1 15

اور وہ اس کے بندوں میں سے اس کی اولاد مقرر کرتے ہیں۔(2985) انسان کھلا ناشکر گزار ہے۔

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾

کیا اس نے اپنی مخلوق سے (اپنے لیے) بیٹیاں بنالیں اور تمہیں بیٹوں کے لیے چن لیا؟

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اور جب ان میں سے کسی کو اس کی خوش خبری دی جاتی ہے جو وہ رحمٰن کے لیے مثال بیان کرتا ہے، تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔(2986)

اَوَ مَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَ هُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ ﴿۱۸﴾

کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے اور وہ جھگڑے میں کھول کر بات نہ کر سکے۔(2987)

2985- ﴿جُزْءًا﴾ کے معنی بعض یا حصہ ہیں اور یہاں بعض مفسرین نے وَلَدٌ یا بیٹا اور بعض نے عَدْلٌ یا اس کا ہمسر مراد لیا ہے۔(ج) اور یہ جو کہا گیا ہے کہ جُزْءٌ لغت عرب میں بمعنی اُنَاثٌ ہے تو زمخشری اسے غلط قرار دیتا ہے۔

یہاں انتقال مضمون اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹا منسوب کرنے کی طرف کیا ہے اور اگلے رکوع میں عرب کے اس عقیدہ کا ذکر ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ چونکہ عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت اور عرب کا یہ عقیدہ باہم ملتے جلتے ہیں اس لیے دونوں کا ذکر ایک جگہ کیا ہے۔ اس رکوع میں اصل ذکر بعثت انبیاء کا تھا۔ اس کے آخر پر اس عقیدہ کا ذکر یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ تمام انبیاء کی اصولی تعلیم اللہ تعالیٰ کی توحید ہی رہی ہے۔ یہ مشرکانہ عقیدہ کہ اس کا بیٹا یا بیٹیاں بھی ہیں، لوگوں کا اپنا افترا ہے۔ کسی نبی نے یہ تعلیم نہیں دی۔

2986- یہی مضمون [النحل: 16:57-58] اور [الصافات: 37:149-153] میں بیان ہو چکا ہے۔ یعنی **ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا**۔ ﴿بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے اور مثل سے مراد یہاں شبہ ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ کی مثل یا اس کی جنس سے قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ اولاد والد کی جنس سے ہوگی۔ پس اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد منسوب کرنا گویا دوسروں کو اس کی جنس سے یا اس جیسا قرار دینا ہے اور پہلی آیت میں ﴿مِمَّا يَخْلُقُ﴾ اس لیے بڑھایا کہ مخلوق تو تغیر اور فنا کے نیچے ہے اسے اللہ تعالیٰ جیسا قرار دینا کیسی بعید از عقل بات ہے۔

2987- ﴿يُّنَشَّؤُا﴾ نَشْءٌ اور نَشْأَةٌ کسی چیز کا حادث کرنا اور اس کی تربیت کرنا ہے۔ ﴿وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى﴾ [الواقعة: 56:62]

وَ جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۹

اور انہوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں دیویاں بنایا، کیا وہ ان کی پیدائش پر موجود تھے؟ ان کی گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے پوچھا جائے گا۔ (2988)

''اور تم پہلی پیدائش کو جانتے ہو۔'' اور ﴿نَاشِئَةَ الَّيْلِ﴾ [المزمل: 6:73] ''رات کا اٹھنا۔'' میں مراد قیام نماز اور نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے۔ اور [نَشْأَ السِّحَابُ] کے معنی ہیں بادل ہوا میں پیدا ہوا اور بڑھتا گیا۔ اسی معنی میں ہے ﴿وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ﴾ [الرعد: 12:13] ''اور بھاری بادل اٹھاتا ہے۔'' اور اِنْشَاءٌ ایک چیز کا وجود میں لانا اور اس کی تربیت کرنا ہے۔ اور اس کا اکثر استعمال جانداروں میں ہے۔ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ﴾ [الأنعام: 98:6] ''وہی ہے جس نے پیدا کیا۔'' ﴿وَ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝﴾ [الأنعام: 6:6] ''اور ان کے پیچھے دوسری نسل پیدا کر دی۔'' ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ﴾ [المؤمنون: 14:23] ''پھر ہم نے اسے ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔'' ﴿وَ نُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [الواقعة: 61:56] ''اور تمہیں اس صورت میں پیدا کریں گے جو تم نہیں جانتے۔'' ﴿يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ﴾ [العنكبوت: 20:29] ''آخرت کا اٹھانا اٹھائے گا۔'' یہ سب وہ وجود میں لاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے خاص ہے اور یہاں معنی تربیت کرنا ہیں۔ (غ)

زیورات میں پرورش پانے والے کے متعلق دو قول ہیں۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ اس معنی کے لحاظ سے عورتوں کے لیے زیورات وغیرہ کے پہننے کا جواز اور مردوں کے لیے اس کے عدم جواز کا استدلال کیا گیا ہے۔ اور ابن زید کا قول ہے کہ اس سے مراد ان کے بت ہیں جو وہ سونے اور چاندی سے بناتے تھے۔ اور ﴿يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ﴾ سے مراد زیورات سے ان کا بنانا ہے۔ (ج) اور ﴿فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ بھی بتوں پر صادق آ سکتا ہے۔ اور اس صورت میں نفی ابانۃ سے مراد نفی خصام ہوگی۔ (ح) یعنی وہ دلیل دینے یا کچھ بیان کرنے یا جھگڑا کرنے کے قابل ہی نہیں۔ اور چونکہ اگلی آیت میں اناث سے مراد ان کی دیویاں یا ان کے بت ہی ہیں جس کے لیے [دیکھو نمبر: 734]۔ اس لیے یہاں بھی بتوں کا ذکر ہی اصل منشا معلوم ہوتا ہے۔ اور **بتوں کو زیورات یعنی سونے چاندی اور جواہرات سے مرصع کرنا** بت پرستوں میں عام رواج ہے۔ اور بتوں کے دلیل نہ دینے یا بولنے کو دوسری جگہ بطور دلیل پیش کیا گیا ہے۔ ﴿فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾ [الأنبيآء: 63:21] ''سو ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہیں۔'' ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا﴾ [طٰهٰ: 89:20] ''کیا وہ غور نہ کرتے تھے کہ وہ ان کی بات کا جواب نہ دیتا۔''

2988- **بتوں کو ملائکہ کا مظہر قرار دینا:** فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دے کر ان کی عبادت بھی کرتے تھے۔ جیسے کہ اگلی آیت سے ظاہر ہے۔ پس اناث سے مراد انہیں دیویاں قرار دینا ہی ہے اور چونکہ ان کے بتوں کے نام جن کی وہ عبادت کرتے تھے عورتوں پر تھے اور فرشتوں کی اور کسی رنگ میں ان کا عبادت کرنا معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں یا اپنی دیویوں کو ملائکہ کا مظہر قرار دیتے تھے جس پر دوسری جگہ قرآن کریم میں شہادت موجود ہے کہ جب فرشتوں سے کہا

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۲۰﴾

اور کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں وہ محض اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾

کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے؟ جس سے وہ دلیل پکڑتے ہیں۔ (2989)

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾

بلکہ کہتے ہیں ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان کے قدموں کے نقشوں پر چلنے والے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے کہا ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک طریق پر پایا اور ہم ان کے قدموں کے نقشوں کے پیچھے چلتے ہیں۔

قٰلَ اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ؕ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾

(ڈرانے والے نے) کہا کیا اگر میں تمہارے پاس اس سے زیادہ ہدایت والی بات لایا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا۔ انہوں نے کہا ہم اس کا جو تمہیں دے کر بھیجا گیا ہے انکار کرنے والے ہیں۔ (2990)

جائے گا کہ کیا یہ تمہاری عبادت کرتے تھے؟ تو وہ جواب میں کہیں گے ﴿بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ﴾ [السبأ: 41:34] ''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔''

2989- پہلی آیت میں فرمایا کہ ان کے پاس اس عقیدہ کے متعلق کوئی علم نہیں یعنی عقلی دلیل نہیں۔ یہاں فرمایا کہ کوئی کتاب بھی ان کے پاس نہیں۔ کسی نبی یا راستباز کی یہ تعلیم نہیں۔ بالفاظ دیگر نقلی دلیل بھی کوئی نہیں۔ اگلی آیت میں اُمَّةٍ کے معنی دین کے لیے [دیکھو نمبر: 2183] یہی معنی مجاہد نے کیے ہیں۔ (ج)

2990- ﴿قٰلَ﴾ میں ضمیر نَذِيْرٌ کی طرف جاتی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہے اور نَذِيْرٌ کا اپنی تعلیم یا اپنے دین کو اَهْدٰى کہنا اس لحاظ

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع

تو ہم نے انہیں سزا دی۔ سو دیکھ کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾

اور جب ابراہیم نے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے کہا، میں اس سے بیزار ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔

اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ﴿۲۷﴾

مگر وہ جس نے مجھے پیدا کیا۔ سو وہی مجھے سیدھی راہ دکھائے گا۔ (2991)

وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور اس نے اپنی اولاد میں یہ کلمہ پیچھے چھوڑا تا کہ وہ رجوع کریں۔ (2992)

سے ہے کہ باوجود تعلیم کے بگڑ جانے کے کچھ نہ کچھ ہدایت ہر قوم کے پاس ہوتی ہے۔

2991- یعنی میں سوائے ایک پیدا کرنے والے کی اور کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ اِلَّا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ اور ہدایت دینے سے مراد صحیح تعلیم پر قائم کرنا نہیں کیونکہ وہ تو قائم ہیں۔ اور سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہیں کرتے بلکہ منزل مقصود پر پہنچانا ہے۔ [دیکھو نمبر: 5]

2992- عَقِبٌ۔ عَقِبٌ پاؤں کے پچھلے حصہ کو کہا جاتا ہے اور استعارۃً بیٹے اور بیٹے کے بیٹے پر اس کا استعمال ہوتا ہے جیسا یہاں۔ اور [جَاءَ فِيْ عَقِبِهٖ] اس سے کچھ بقیہ باقی رہ گیا اور [اَعْقَبَهٗ كَذَا] کے معنی ہیں اس چیز کا اسے وارث کر دیا ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا﴾ [التوبة: 77:9] ''سو اس نے انہیں بدلہ دیا (کہ) نفاق پیدا کر دیا۔'' (غ) اور بعض نے ﴿فِيْ عَقِبِهٖ﴾ کے معنی ﴿مِنْ خَلْفِهٖ﴾ کیے ہیں یعنی اپنے پیچھے۔ اور بعض نے عقب ابراہیم سے مراد آل محمد ﷺ کو لیا ہے۔ (ج) اوپر ذکر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام معبودان باطل سے بیزاری کا اظہار کیا اور **توحید الٰہی پر** قائم ہوئے ﴿اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ﴾۔ جعل میں فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور ابراہیم بھی۔ اور ھا کی ضمیر اسی کلمہ توحید کی طرف ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ﴾ [البقرة: 132:2] ''اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو یہی وصیت کی اور یعقوب نے (بھی)۔'' اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول ﴿اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ﴾ [البقرة: 133:2] ''جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا ہم تیرے خدا کی عبادت کریں گے اور تیرے بڑوں کے خدا کی۔'' مطلب یہ ہے کہ توحید الٰہی کے مذہب کو ہی ابراہیم نے اپنی اولاد میں باقی چھوڑا۔ اور ﴿يَرْجِعُوْنَ﴾ میں

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۹﴾

بلکہ میں نے انہیں اور ان کے باپ داداؤں کو سامان دیا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنے والا رسول آیا۔ (2993)

وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور جب حق ان کے پاس آیا کہنے لگے یہ جادو ہے اور ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں۔ (2994)

وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾

اور کہنے لگے کیوں یہ قرآن دو بستیوں کے کسی بڑے آدمی پر نہ اتارا گیا؟ (2995)

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ

کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے ہیں۔ تاکہ ایک دوسرے سے کام لیتا رہے اور تیرے رب کی رحمت

رجوع سے مراد اسی صحیح تعلیم کی طرف رجوع ہے۔ یعنی ملک عرب میں یہ تعلیم باقی چلی آتی ہے۔ پس اگر یہ لوگ غور کریں تو بت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی طرف رجوع کریں۔

2993- یعنی ان کے مشرکانہ عقائد اور ان کی بدکرداریوں پر گرفت نہیں کی۔ اور حَقٌّ قرآن کریم ہے۔

2994- یہاں قرآن کریم کو سحر کہا ہے۔ اس لیے کہ اس کی تعلیم دلوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ [دیکھو نمبر: 129] انبیاء کو ساحر کہنے کی اصل وجہ یہی ہے۔

2995- ﴿الْقَرْيَتَيْنِ﴾ یعنی دو بستیوں میں اشارہ مکہ اور طائف کی طرف ہے۔ اور [رَجُلٍ عَظِيْمٍ] سے مراد جاہ و مال والا آدمی ہے۔ جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ کیونکہ کفار کی نظر میں **عظمت کا انحصار** مال دنیا پر تھا اور مال دنیا کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے نہ تھے۔ ہاں نیکی اور راستبازی میں آپ کا مرتبہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا اعتراف سب عرب کو تھا۔ بعض لوگوں نے خاص نام لیے ہیں مثلاً مکہ میں ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ کا نام اور طائف میں حبیب بن عمرو یا ابن عبد لیل یا ابن مسعود ثقفی کا نام، مگر اس تعین کی کوئی ضرورت نہیں۔

رَحۡمَتُ رَبِّكَ خَيۡرٌ مِّمَّا يَجۡمَعُوۡنَ ﴿۳۲﴾

اس سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ (2996)

وَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ يَّكُوۡنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلۡنَا لِمَنۡ يَّكۡفُرُ بِالرَّحۡمٰنِ لِبُيُوۡتِهِمۡ سُقُفًا مِّنۡ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيۡهَا يَظۡهَرُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی گروہ ہو جائیں گے تو ہم ان کے لیے جو رحمٰن کا انکار کرتے ہیں ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں (بھی) جن پر وہ چڑھتے ہیں۔ (2997)

وَ لِبُيُوۡتِهِمۡ اَبۡوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيۡهَا يَتَّكِـُٔوۡنَ ﴿۳۴﴾

اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں۔

2996- ﴿رَحۡمَتَ رَبِّكَ﴾ سے مراد نبوت یا اللہ تعالیٰ سے قرب کا تعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باطنی نعمتوں کی تقسیم ان کے ہاتھ میں نہیں۔ بلکہ ظاہری نعمتوں کی تقسیم بھی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ظاہری قانون قدرت یہ ہے کہ سامان روزی کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تا کہ **ایک دوسرے سے خدمت** کے کام لے سکیں اور نظام قائم رہے۔ تو جس طرح **بعض مصالح کی بنا پر یہ اختلافات ظاہری** ہیں یہی حالت اختلافات روحانی کی ہے اور کون شخص فی الحقیقت دوسروں پر فضیلت رکھتا ہے اور کس کی قوت قدسی دوسروں کو نیکی کی راہ پر لا سکتی ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

2997- ﴿فِضَّةٍ﴾ فِضَّ کے لیے [دیکھو نمبر: 551] کسی چیز کا توڑنا ہے۔ اور ﴿فِضَّةٍ﴾ چاندی کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ جواہر میں یہ سب سے ادنیٰ درجہ پر ہے جس سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ (غ)

﴿مَعَارِجَ﴾ معراج کی جمع ہے۔ [دیکھو نمبر: 2348]

لوگوں کے لیے ﴿اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ یا ایک ہی گروہ ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ سب کفر پر جمع ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ مال دنیا تو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک حقیر شے ہے اور وہ کفار کو اتنا مال بھی دے دے کہ ان کے گھروں کی چھتیں اور سیڑھیاں اور دروازے اور ان کے بیٹھنے کے تخت سب سونے چاندی کے ہوں لیکن اس صورت میں لوگ سب کے سب کفر کی طرف ہی جھک جائیں اور مال دنیا کو ہی اپنا مطلوب اور مقصود بنالیں۔ آج اس آیت کی سچائی کس قدر عیاں ہو رہی ہے کہ یورپ کی کافر قوموں کو اللہ تعالیٰ نے کچھ وافر حصہ مال دنیا سے دیا، تو کس طرح پر سب لوگ ان کی پیروی کر کے مال دنیا کے حصول پر ہی گر گئے ہیں اور شب و روز ہر ایک کو یہ فکر ہے کہ اس کا گھر نہایت خوبصورت بن جائے اور اس میں بیش قیمت سامان ہو۔ اس ہوس نے آج دنیا کو اخلاق فاضلہ کے لیے قدم اٹھانے سے محروم کر رکھا ہے۔ ہاں یہ چیزیں اپنی ذات میں بری بھی نہیں لیکن ان کو مطلوب اور

وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾ ع

اور سونے کے (بھی) اور یہ سب صرف دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت تیرے رب کے نزدیک متقیوں کے لیے ہے۔ (2998)

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾

اور جو کوئی رحمٰن کی یاد سے منہ پھیر لے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں۔ سو وہ اس کا ساتھی ہو جاتا ہے۔ (2999)

مقصود بنالینا انسان کو اپنے کمال حقیقی سے محروم کر دینا ہے۔

2998- ﴿زُخْرُفَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 1388] زینت اور کمال حسن کو بھی ﴿زُخْرُفَ﴾ کہا جاتا ہے یا ملمع کو اور سونے کو بھی۔ اور ابن زید کا قول ہے کہ ﴿زُخْرُفَ﴾ سے مراد اثاث البیت اور اس کا تجمل ہیں۔ (ر) اور سونا معنی لے کر [زُخْرُفًا مِّنْ زُخْرُفٍ] کے قائم مقام ہوگا۔ یعنی یہ چیزیں چاندی اور سونے کی بنادیں اور آخری الفاظ میں فرمایا کہ یہ محض دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور آخرت ان لوگوں کے لیے ہے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لیے ہر قسم کی قربانی کرتے ہیں اور سونے چاندی کی پرستش نہیں کرتے۔

2999- ﴿يَّعْشُ﴾ عَشَا نظر کی کمی ہے دن کو ہو یا رات کو۔ اور بعض کے نزدیک وہ رات کے وقت نظر کا نقص ہے اور وہ اندھا پن نہیں اور عَشَا يَعْشُوْ کے معنی ہیں اس کی نظر کمزور ہوگئی۔ اور [عَشَوْتَ اِلَى النَّارِ] کے معنی ہیں آگ کا قصد کیا اس کے ساتھ ہدایت پاتے ہوئے اور [عَشَوْتَ مِنْهَا] کے معنی ہیں اس سے اعراض کیا۔ (ل)

شیطان کس انسان کا قرین بنتا ہے:

﴿نُقَيِّضْ﴾ قَيَّضَ کے معنی اور شیطان کے انسان پر مقرر یا مسلط ہونے کے لیے [دیکھو نمبر: 2937] اس آیت سے اور [حٰمٓ: 25] سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان ہر انسان کا قرین نہیں۔ بلکہ وہ صرف انہی کے لیے قرین بنتا ہے جو خود حق اور صداقت سے منہ پھیرتے ہیں۔ شیطان کی وسوسہ اندازی عام ہے مگر اس کے وسوسوں کو قبول سب نہیں کرتے۔ ﴿قَرِيْنٌ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 658] جب انسان شیطان کے وسوسے کو رد کرتا ہے تو اس کی وسوسہ اندازی بھی کم ہو جاتی ہے۔ اور جس قدر زیادہ وہ اس کے وساوس کو قبول کرتا جاتا ہے اسی قدر زیادہ اس کا تعلق اس سے ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کا دائمی رفیق ہو جاتا ہے۔ شیطان تو وہی ہے مگر وہ قرین صرف بدکاروں کا ہوتا ہے۔

وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور وہ انہیں رستے سے روکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پانے والے ہیں۔ (3000)

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾

یہاں تک کہ جب ہمارے پاس آتا ہے کہتا ہے اے کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی۔ سو کیا برا ساتھی ہے۔ (3001)

وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور آج تمہیں یہ بات فائدہ نہ دے گی، جبکہ تم ہی ظالم ہو کہ تم عذاب میں شریک ہو۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى الْعُمْىَ وَ مَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾

تُو کیا بہروں کو سنا سکتا ہے یا اندھوں کو رستہ دکھا سکتا ہے اور اسے جو کھلی گمراہی میں ہے؟ (3002)

فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ﴿۴۱﴾

سو اگر ہم تجھے لے جائیں تو بھی انہیں ہم سزا ہی دینے والے ہیں۔

اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِىْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا

یا تجھے دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ تو ہم

3000 - بدی کب اچھی معلوم ہوتی ہے؟ روکنے والے وہی شیاطین ہیں مگر وہ بدی کو ایسا خوبصورت کر کے بتاتے ہیں کہ بدکار سمجھتے ہیں کہ ہم راہ راست پر ہیں اور اچھا کام کر رہے ہیں۔ جب انسان بدی میں بہت زیادہ مبتلا ہو جاتا ہے تو اسی بدی کو وہ اچھا سمجھنے لگتا ہے اس لیے کہ نور فطرت بالکل دب جاتا ہے۔ ورنہ اصل حالت فطرت انسان کی یہ نہیں۔

3001 - ﴿الْمَشْرِقَيْنِ﴾ سے مراد مشرق ومغرب ہیں۔ (ج) بعض نے گرمی اور سردی کے مشرق مراد لیے ہیں۔

3002 - قرآن شریف نہ صرف اندھوں کو رستہ دکھاتا اور بہروں کو سناتا ہے بلکہ مردوں تک کو زندہ کرتا ہے۔ ﴿اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾ [الأنعام: 122:6] ''اور کیا وہ جو مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا'' یہاں مراد وہ لوگ ہیں جو دیکھنا چاہتے ہی نہیں اور نہ سننا چاہتے ہیں اور مراد روحانی اندھے اور روحانی بہرے ہیں۔ جیسا کہ آیت کے آخری الفاظ صاف بتاتے ہیں۔

عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ﴿۴۲﴾

ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ (3003)

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۴۳﴾

سو اسے مضبوط پکڑ لے جو تیری وحی کی گئی ہے۔ بے شک تو سیدھے رستے پر ہے۔

وَ اِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ لِقَوْمِكَ ۚ وَ سَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور یقیناً وہ تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے شرف ہے اور تم سے پوچھا جائے گا۔

وَ سْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ ع 4 10 10

اور ان سے پوچھ جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا۔ کیا ہم نے رحمٰن کے سوائے (اور بھی) معبود بنائے تھے جن کی عبادت کی جائے؟ (3004)

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰي بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا۔ تو اس نے کہا میں جہانوں کے رب کا رسول ہوں۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾

سو جب وہ ہمارے نشان لے کر ان کے پاس آیا تو وہ ان پر ہنسی کرنے لگے۔

3003 - ان دونوں آیات میں یہ بتایا ہے کہ بدی کی سزا تو بدکاروں کو مل کر رہے گی، کسی کو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں مل جائے تو کیا اور بعد میں مل جائے تو کیا۔ چونکہ اسلام کے مخالف تو آپ کے بعد بھی پیدا ہوتے رہنے تھے، اس لیے فرمایا کہ بعد میں بھی سزا ملتی رہے گی۔

3004 - یہاں سوال رسولوں سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں۔ اس لیے مراد ان رسولوں کی امتیں لی گئی ہیں یا رسولوں سے سوال سے مراد ان کی تعلیم کو دیکھنا ہے کہ کوئی رسول اللہ تعالیٰ کی طرف شرک کی تعلیم کو منسوب نہیں کرتا اور اصل غرض مشرکین پر اتمام حجت ہے کہ جن انبیاء کو وہ مانتے ہیں وہ تو شرک کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔

وَ مَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور ہم انہیں کوئی نشان نہ دکھاتے تھے مگر وہ اپنی نوع کے (پہلے نشان) سے بڑا ہوتا تھا اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا، تاکہ وہ رجوع کریں۔ (3005)

وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور انہوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر جیسا اس نے تجھ سے عہد کیا ہے، ہم ضرور ہدایت پانے والے ہیں۔ (3006)

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿۵۰﴾

سو جب ہم نے ان سے عذاب دور کر دیا تو وہ عہد شکنی کرنے لگے۔

وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی کہا اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں اور یہ نہریں ہیں جو

3005 - **اخت ہارون:** اُخْتٌ [دیکھو نمبر: 634] و [نمبر: 1079] اور یہاں اُخْتِهَا سے مراد ہے وہ نشان جو اس سے پہلے گزر چکا اور اسے اس کی اخت اس لحاظ سے کہا کہ صحت اور بیان کرنے اور صدق میں وہ دونوں شریک ہیں۔ (غ) اور ﴿يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ﴾ [مریم: 28:19] ''اے ہارون کی بہن۔'' میں ایک توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد [اُخْتِهٖ فِي الصَّلَاحِ] ہے یعنی صلاحیت میں اس کی بہن اور بلحاظ نسب بہن ہونا مراد نہیں۔ (غ)

نشانوں سے مراد حضرت موسیٰؑ کی سچائی کے نشانات ہیں اور اس میں وہ معجزات بھی ہیں جن کا ذکر دوسری جگہ ہے [دیکھو نمبر: 1143] اور سورۃ [الأعراف: 133] وغیرہ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عصا کے سانپ بننے اور ید بیضا سے بڑھ کر معجزات وہ تھے جو ان سے پیچھے دکھائے گئے اور کسی نشان کا بڑا ہونا بلحاظ اس کی وضاحت کے اور اس اثر کے ہے جو وہ ایک چیز کی صداقت پر پیدا کرتا ہے۔ اور سچائی کا یہی نشان ہے کہ وہ روز بروز زیادہ واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اس پر نئے سے نئے دلائل پیدا ہوتی جاتی ہیں اور ہر ایک قسم کا دھندلا پن اس کی دلائل سے دور ہوتا جاتا ہے۔

3006 - ﴿سٰحِرُ﴾ سَاحِرٌ کے معنی ان کے نزدیک عالم تھے اور سحر ان کے نزدیک مذموم نہیں تھا اور مراد اس سے عالم ہے۔ (ج) یہی مضمون [نمبر: 1144] میں ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾

میرے نیچے بہتی ہیں۔(3007) تو کیا تم دیکھتے نہیں؟

اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ مَهِیْنٌ ۙ۬ وَّ لَا یَكَادُ یُبِیْنُ ﴿۵۲﴾

بلکہ میں اس سے بہتر ہوں جو ذلیل ہے اور کھول کر بیان نہیں کرسکتا۔(3008)

فَلَوْ لَاۤ اُلْقِیَ عَلَیْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِیْنَ ﴿۵۳﴾

تو اس پر سونے کے کڑے کیوں نہ اتارے گئے یا اس کے ساتھ فرشتے اکٹھے ہو کر (کیوں نہ) آئے؟(3009)

3007- ﴿مِنْ تَحْتِیْ﴾ [مِنْ بَیْنَ یَدِیْ فِی الْجَنَانِ] (ج) یعنی میرے سامنے باغوں میں یا مراد یہ ہے کہ میرے زیر حکومت جن سے میں جس طرح چاہوں فائدہ اٹھاؤں۔ بہشتیوں کے متعلق بھی ایسے ہی الفاظ آتے ہیں۔ ﴿تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ جس سے مراد یہی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں۔ اور تَحْتَ۔ فَوْقَ کے مقابل پر ہے اور تَحْتَ کا استعمال اس چیز میں ہوتا ہے جو الگ ہو اور اسفل کا اس میں جو ساتھ ملی ہوئی ہو۔ (غ) اور جس طرح فَوْقَ بلحاظ مرتبہ ہوسکتا ہے، تَحْتَ بھی بلحاظ مرتبہ ہوسکتا ہے۔

3008- ﴿مُهِیْنٌ﴾ مَهْنَةٌ کے معنی خدمت کرنا ہیں اور ﴿مُهِیْنٌ﴾ مردوں میں سے ضعیف یعنی کمزور کو کہا جاتا ہے۔ اور حدیث میں نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے کہ آپ ﴿مُهِیْنٌ﴾ نہ تھے اور دوسری جگہ ہے ﴿وَ لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍ ۙ﴾ [القلم: 10:68] ''اور تو کسی قسمیں کھانے والے ذلیل (آدمی) کی بات نہ مان۔'' جہاں مراد فاجر ہے اور مَهَانَةٌ (بمعنی قلت) سے ہے۔ اور رائے اور تمیز کی کمی سے مراد ہے اور ﴿مَّآءٍ مَّهِیْنٍ﴾ [السجدة: 8:32] سے مراد بھی تھوڑا پانی ہے یا کمزور۔ (ل)

ایک طرف اپنی حکومت اور بادشاہت کا ذکر کیا ہے اور دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کمزوری کا کہ وہ ایک محکوم قوم سے تھے اور ﴿لَا یَكَادُ یُبِیْنُ﴾ میں یہ کہا ہے کہ نہ صرف قومی طور پر محکوم ہے، بلکہ ذاتی وصف بھی اس میں نہیں کہ کوئی زبردست تقریر کرسکے۔

3009- ﴿مُقْتَرِنِیْنَ﴾ اِقْتِرَانٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 906] کسی معنی میں دو یا زیادہ چیزوں کا اکٹھا ہونا ہے۔ (غ) اور یہاں مراد اکٹھے چلتے ہوئے لیے گئے ہیں۔ یا ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے یا ایک دوسرے سے ملے ہوئے۔ (ج) اور یہ کنایہ اعانت سے ہے اس لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے معنی کیے ہیں جو اس کی مدد کریں ان کے مقابل پر جو اس کے مخالف ہیں۔ (ر)

سونے کے کڑے پہننے سے مراد:

مجاہد کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کو سردار بنایا جاتا تھا تو اسے سونے کے کڑے اور سونے کا طوق پہنایا جاتا تھا۔ (ر) گویا سونے کے کڑوں کا پہنانا نشان ریاست تھا اور فرعون کا مطلب یہ تھا کہ خدا نے ایک ایسے شخص کو رسول بنایا جو ریاست سے حصہ نہیں

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾

سو اس نے اپنی قوم کو خفیف کیا تو انہوں نے اس کی بات مان لی۔ وہ نافرمان لوگ تھے۔

فَلَمَّاۤ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ۙ

سو جب انہوں نے ہمیں ناراض کیا تو ہم نے انہیں سزا دی۔ پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ (3010)

ع 5 11 11 فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

سو انہیں گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لیے کہاوت بنا دیا۔ (3011)

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾

اور جب مریم کے بیٹے کی مثال بیان کی جاتی ہے تو تیری قوم اس پر چلا اٹھتی ہے۔ (3012)

رکھتا۔ جیسا کفار مکہ کا قول دوسری جگہ ہے۔ ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾﴾ [31]

3010- ﴿اٰسَفُوْنَا﴾ اَسَفٌ [دیکھو نمبر: 1157] اور اٰسَفٌ کے معنی ہیں اَغْضَبَ ناراض کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا اور غضب ہماری طرح نہیں بلکہ اپنے اولیاء میں ان کی رضا کو اپنی رضا اور ان کے غضب کو اپنا غضب ٹھہرایا اسی لیے کہا [مَنْ اَهَانَ لِي وَلِيًّا فَقَدْ بَارَزَنِيْ بِالْمُحَارَبَةِ] (شرح السنة، جلد1، صفحہ306) جو شخص میرے ولی کی اہانت کرتا ہے وہ میرے ساتھ جنگ کرتا ہے۔ (غ) اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب یا اسف میں جو انسان سے تعلق رکھنے والا حصہ یعنی ثوران دم القلب ہے وہ باقی نہیں رہتا صرف نتیجہ باقی رہتا ہے جو سزا دینا ہے۔ [دیکھو نمبر: 27]

3011- ﴿سَلَفًا﴾ سَلَفٌ [دیکھو نمبر: 352] متقدم ہے یعنی جو پہلے گزر چکا اور مراد ان کی ہلاکت ہے اور ان کا آگ میں پہلے جانا بھی مراد لیا گیا ہے اور مثل سے مراد ان کا عبرت ہونا ہے۔

3012- ﴿يَصِدُّوْنَ﴾ صَدَّ کی مضارع جب يَصُدُّ ہو تو اس کے معنی اعراض کرنے کے ہوتے ہیں اور يَصِدُّ ہو تو اس کے معنی ضَجَّ یعنی فریاد کرنا یا چلا اٹھنا ہیں۔ (ل)

حضرت عیسیٰؑ اور معبودان عرب:

مجاہد کا قول اس آیت کی تفسیر میں یہ ہے کہ قریش کہتے تھے کہ محمد ﷺ یہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی عبادت کریں جس طرح عیسیٰ کی عبادت عیسیٰ کی قوم کرتی ہے۔ (ج) اور ایک روایت میں ہے کہ عبداللہ بن الزبعری نے آنحضرت ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا ﴿اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبیآء: 98:21] ”تم اور وہ چیزیں جن کی تم اللہ کے سوائے عبادت

وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ۔ یہ اسے تیرے لیے بیان نہیں کرتے مگر جھگڑنے کو۔ بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہی ہیں۔ (3013)

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾

وہ (اور) کچھ نہیں مگر ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا اور اسے بنی اسرائیل کے لیے نمونہ بنایا۔ (3014)

کرتے ہو دوزخ کا ایندھن ہو۔'' تو کہا کہ حضرت عیسیٰ کی نصاریٰ عبادت کرتے ہیں اور آپ اسے نبی اور عبد صالح بتاتے ہیں۔ تو اگر وہ آگ میں جائیں گے تو ہم اور ہمارے معبود بھی آگ میں جانے پر راضی ہیں۔ (ر) اصل مطلب صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست دیکھتے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عزت کرتے ہیں اور ان کے بتوں کی نہیں کرتے۔ اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہمارے معبود بہتر ہیں یا عیسیٰ۔ یہ عرب کے معبود تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک دوسری قوم کے معبود تھے، تو وہ اس بات پر چلا اٹھتے کہ کیا وجہ ہے کہ ایک غیر قوم کے معبود کی عزت کی جاتی ہے اور اپنے معبودوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ اس کا جواب [آیت:59] میں دیا ہے کہ اس کی عزت اس وجہ سے ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کا ایک برگزیدہ بندہ تھا، نہ اس وجہ سے کہ وہ ایک قوم کا معبود ہے۔ اور [آیت:64] میں بتایا کہ وہ اپنے آپ کو معبود بنا کر پیش نہ کرتا تھا بلکہ وہ تو اللہ کی عبادت کی طرف ہی بلاتا تھا۔ ان کی امت نے ایک غلط راہ پر قدم مار کر انہیں خدا بنا لیا ہے۔

3013- ﴿ضَرَبُوْهُ﴾ ضَرَبَ کا لفظ جب مَثَلَ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی بیان کرنے کے ہوتے ہیں۔ جیسے ﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ﴾ [یٰسٓ: 13:36] ''اور ان کے لیے گاؤں کے رہنے والوں کی مثال بیان کر۔'' ﴿وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [الکھف: 45:18] ''اور ان کے لیے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کر۔'' یا جیسے اوپر کی آیت میں ﴿وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا﴾ اور بعض وقت صرف لفظ ضرب مثال بیان کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے ﴿كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ﴾ [الرعد: 17:13] ''اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے۔'' اور یہاں ﴿ضَرَبُوْا﴾ اسی معنی میں ہے اور یہاں ان کا بیان بمقابلہ اس بیان کے ہے جو قرآن شریف نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ وہ بھی تو ایک قوم کا معبود ہے۔ یہ ان کا کہنا محض جھگڑے اور مقابلہ کے لیے ہے۔ بلکہ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔ ہر بات میں جھگڑا کرنا ہی ان کا کام ہے۔ کیونکہ خَصِمٌ اسے کہتے ہیں جو جھگڑے سے مختص ہو۔ [دیکھو نمبر: 2832]

3014- **حضرت عیسیٰؑ کا مثل ہونا:** ﴿مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ میں مَثَلَ کے معنی اٰيَةٌ یا نشان کیے گئے ہیں۔ جس کی تشریح ابن جریر یوں کرتے ہیں [اٰيَةً لِبَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَ حُجَّةً لَنَا عَلَيْهِمْ بِاِرْسَالِنَا اِلَيْهِمْ بِالدُّعَاءِ اِلَيْنَا] یعنی بنی اسرائیل کے لیے نشان اور ہماری ان پر حجت اس لیے کہ ہم نے انہیں اپنی طرف بلانے کے لیے اسے بھیجا اور یا چونکہ مثل تشبیہ کے طور پر بیان

وَ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾

اور اگر ہم چاہتے تو تم میں فرشتے مقرر کر دیتے جو زمین میں خلیفہ ہوتے۔ (3015)

وَ اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

اور یقیناً یہ (موعودہ) گھڑی کے لیے علم ہے سو تم اس کے متعلق شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہ سیدھا راستہ ہے۔ (3016)

کی جاتی ہے۔ اس لیے مراد اس سے ان کے لیے نمونہ بنانا ہے جس کی زندگی کے مطابق وہ اپنی زندگیاں بنائیں اور یا حسنات میں مثل مراد ہے اور اس صورت میں بھی معنی نمونہ ہی ہوں گے۔

3015- **خلیفۃ اللہ انسان ہی ہو سکتا ہے:** ﴿مِنْكُمْ﴾ کے ایک معنی [بَدَلًا مِّنْكُمْ] کیے گئے ہیں اور مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تم سب کو ہلاک کر دیں اور تمہاری جگہ فرشتوں کو لے آئیں۔ (ج) اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تمہاری جگہ خلافت روحانی یعنی نبوت کے لیے فرشتے بھیج دیتے اور اس میں نصاریٰ کے عقیدے کی تردید ہے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی گناہ گاری کی وجہ سے ضروری ہوا کہ خود خدا انسان بنے۔ تو بتایا کہ خدا کو انسان بناتے ہو۔ اگر ایسا بھی تھا کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ نا قابل خلافت پاتا اور خلافت کے لیے کسی اور کی ضرورت ہوتی تو وہ انسانوں کے لیے فرشتے بنا دیتا جو خلیفۃ اللہ کا کام کرتے۔ کیونکہ فرشتے تو معصوم عن الخطا بھی ہیں۔ لیکن وہ تمہارے لیے نمونے کا کام نہ دے سکتے۔ جس طرح بشر رسول نمونے کا کام دیتے ہیں اور نہ انسان ان کے نقش قدم پر چل سکتے۔ تو پھر خدا کے انسان بننے سے کیا غرض حاصل ہو سکتی ہے۔

3016- ﴿اِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ﴾ **سے مراد:** اِنَّهٗ میں ضمیر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بعض اور مفسرین کے نزدیک ابن مریم کی طرف جاتی ہے۔ اور حسن اور قتادہ سے مروی ہے کہ یہ قرآن کی طرف ہے۔ (ج) اس دوسرے قول پر جو اعتراض بعض نے کیا ہے کہ یہاں قرآن کا ذکر پہلے نہیں وہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ بہت موقعوں پر اسی طرح ضمیر قرآن بغیر اس کے پہلے ذکر کے آئی ہے جیسے ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؕ﴾ [القیامۃ: 16:75] ''اس کے ساتھ اپنی زبان کو مت ہلانا تاکہ اسے جلدی لے لے۔'' یا جیسے ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۚ﴾ [القدر: 1:97] ''ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا۔'' اور حق یہی ہے کہ قرآن ہی ساعت کا علم دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ساعت کے لیے نشان تو کہا جا سکتا ہے خواہ نزول عیسیٰ ہی مراد ہو مگر ساعت کا وہ علم نہیں۔ اس لیے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک قراءت بھی ع کی زبر کے ساتھ ہے۔ اور بلحاظ سیاق بھی اس معنی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ جب عیسائیوں کے عقیدہ باطل کا ذکر کیا کہ وہ ایک انسان کو خدا بناتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ آخران کی طاقت پر بھی خاتمہ کی گھڑی آئے گی جس کا علم قرآن شریف نے دے دیا ہے۔ سو وہ اس میں شک نہ کریں اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اختیار کریں کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ اور اگر ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہی لی جائے تو ساعت سے مراد بنی اسرائیل کی ساعت یا قیامت وسطیٰ ہوگی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا (جسے عیسائیوں نے خدا بنا لیا) ظہور بنی اسرائیل کے لیے ایک

وَ لَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾

اور تمہیں شیطان نہ روک دے۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۶۳﴾

اور جب عیسیٰ کھلی دلیلیں لے کر آیا، کہا میں تمہارے پاس حکمت لایا ہوں اور تاکہ میں تمہارے لیے بعض وہ باتیں کھول کر بیان کروں جن میں تم اختلاف کرتے ہو۔ سو اللہ کا تقویٰ کرو اور میری فرمانبرداری کرو۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۴﴾

اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو۔ یہ سیدھا رستہ ہے۔

نشان تھا کہ ان کی ساعت وسطیٰ آ گئی۔ جب نبوت ان سے لے لی جائے گئی جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال میں بھی صاف اس بات کا ذکر ہے:

''اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔'' [متی: 21:43]

اور اس کے آگے آتا ہے کہ کاہن اور فریسی ''سمجھ گئے کہ ہمارے حق میں کہتا ہے۔'' گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آنا ایک نشان تھا کہ اب نبوت ان سے نکل کر دوسری طرف جاتی ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿وَ اتَّبِعُوْنِ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ گویا جس بات کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی وہ خدا کی بادشاہت آ گئی۔ اس لیے تم میری پیروی کرو یہی سیدھا رستہ ہے۔ اور قیامت کے نشانوں میں اگر ہے تو نزول عیسیٰ ہے نہ خود عیسیٰ۔ مگر یہاں ذکر نزول عیسیٰ کا نہیں بلکہ عیسیٰ کا ہے۔ ہم قرآن شریف میں اپنی طرف سے یہ نہیں بڑھا سکتے کہ عیسیٰ سے مراد نزول عیسیٰ لے لیں اور کوئی حدیث بھی آنحضرت ﷺ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی نہیں، جس کی وجہ سے اس قدر تصرف جائز ہو۔ اور پھر اس معنی کے لیے قراءت بھی دوسری اختیار کرنی پڑتی ہے جو قرآن شریف میں نہیں پس پہلے معنی ہی قابل قبول ہیں۔ اور چونکہ ذکر قرآن شریف کا شروع ہو گیا تھا اس لیے دوبارہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تو لفظ عیسیٰ بالتصریح لایا گیا۔ ﴿وَ لَمَّا جَآءَ عِيْسٰى﴾ [63] اگر ضمیر عیسیٰ کی طرف ہی لی جائے تو پھر بھی نزول عیسیٰ مراد نہیں ہو سکتا اور ساعت سے مراد یہودیوں کی تباہی ہے نہ قیامت کبریٰ۔ قیامت کبریٰ کا نشان ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں جو فرماتے ہیں: [بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ] (صحيح البخاری، كتاب الرقاق، باب قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿٦٥﴾

سو ان میں سے (کئی) جماعتوں نے اختلاف کیا۔ سو ان کے لیے جو ظالم ہیں دردناک دن کے عذاب کی وجہ سے افسوس ہے۔ (3017)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٦﴾

یہ صرف (موعودہ) گھڑی کے منتظر ہیں کہ ان پر اچانک آجائے اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٧﴾ ع 6 11 12

متقیوں کے سوائے اس دن دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ (3018)

يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿٦٨﴾ ۚ

اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿٦٩﴾ ۚ

وہ جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور فرمانبردار ہیں۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿٧٠﴾

تم اور تمہارے ساتھی جنت میں داخل ہو جاؤ، عزت کے ساتھ رکھے جاؤ گے۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ

ان پر سونے کی رکابیاں اور پیالے لیے پھریں گے اور اس میں ہے جو دل چاہے اور (جس سے) آنکھیں لذت

بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ: 6504)

3017- ﴿الْاَحْزَابُ﴾ سے مراد نصاریٰ کے مختلف فرقے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ بعض نے یہود و نصاریٰ کا اختلاف مراد لیا ہے۔

3018- ﴿اَلْاَخِلَّآءُ﴾ خَلِيْلٌ کی جمع ہے دیکھو [نمبر: 740] مراد یہ ہے کہ سب محبتیں قیامت کے دن منقطع ہو جائیں گی۔ سوائے اس محبت کے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ یا مراد بدکار اور ان کے ہم صحبت ہیں کہ وہ قیامت میں ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔

تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۚ۷۱ | پائیں۔اور تم اسی میں رہو گے۔(3019)

وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۷۲ | اور یہ وہ جنت ہے جس کے تم وارث کیے گئے ہو۔اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۷۳ | اس میں تمہارے لیے بہت پھل ہیں، جن سے تم کھاتے ہو۔

3019- ﴿بِصِحَافٍ﴾ صِحَافٍ۔ صَحِيْفَةٌ کسی چیز کا وہ ہے جو پھیلا ہوا ہو۔اور اسے بھی کہتے ہیں جس میں لکھا جاتا ہے اور اس کی جمع صَحَائِف اور صُحُف ہے ﴿صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ۱۹﴾[الأعلى: 19:87] ''ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں (میں)۔'' ﴿يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۲ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۳﴾[البينة: 98:2-3] ''جو پاک صحیفے پڑھتا ہے۔جس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔'' جہاں مراد قرآن ہے اور ﴿فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ﴾ اس لیے کہا کہ اس میں پہلی کتب سے بڑھ کر کچھ ہے۔مَصْحَفٌ وہ ہے جس میں لکھے ہوئے صحیفے ہیں اور اس کی جمع مَصَاحِفُ ہے اور صَحْفَةٌ جس کی جمع صِحَافٌ ہے اس کے معنی فراخ پیالہ ہیں۔(غ) یعنی کھانے کے بڑے برتن۔(ث)

﴿اَكْوَابٍ﴾ كَوْبٌ کی جمع ہے وہ پیالہ جس کا دستہ نہ ہو۔(غ) یعنی پینے کے برتن۔

جنت کی نعمتیں اور آرزوئیں:

انسان کو جن چیزوں سے اس دنیا میں خوشی حاصل ہوتی ہے اور جو کھانے پینے کے سامان سے تعلق رکھتی ہیں ان کا ذکر کر کے آگے بڑھایا کہ جنت میں ہر ایک سامان ہوگا جس کی دل آرزو کرے۔مگر چونکہ بسا اوقات غلط آرزو سے انسان اپنی حقیقی راحت کو خراب کر لیتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ ہی بڑھایا کہ وہ چیزیں راحت دینے والی ہوں گی۔اور یہ تو ظاہر ہے کہ دلوں کی آرزوؤں سے مراد کفار کے دل کی آرزوئیں نہیں کہ اس دنیا کی آرائش اور آسائش کے سامان مراد لیے جائیں۔وہ تو دوزخ میں ہوں گے اور ان کے لیے ﴿حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ﴾ کا حکم ہے۔بلکہ راستبازوں کی آرزوئیں مراد ہیں۔اور وہ آرزوئیں جسمانی آسائش کے لیے نہیں ہوتیں بلکہ اخلاقی اور روحانی ترقیات کے لیے ہوتی ہیں اور ان کی آنکھوں کو لذت بھی دنیا کی چیزوں سے نہیں ملتی بلکہ روحانی نعماء سے ملتی ہے۔کسی راستباز کی زندگی میں ہمیں یہ نظر نہیں آتا کہ اس کے دل میں یہ آرزو ہو کہ رہنے کو آراستہ محل اور کھانے کو اعلیٰ درجہ کی چیزیں اور پہننے کو فاخرہ لباس ہوں۔اور روح المعانی میں ہے کہ ﴿تَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ سے اشارہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت کی طرف ہے اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:[وَجُعِلَ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلاَةِ] (سنن نسائی، کتاب عشرة النساء، باب حُبِّ النِّسَاءِ، حدیث: 3956) میری آنکھ کی راحت نماز میں ہے۔اور ظاہر ہے کہ وہاں کا کھانا پینا بھی کوئی اور رنگ رکھتا ہے۔اس کا قیاس اس دنیا کے کھانے پینے پر کرنا صحیح نہیں۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾

مجرم دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔

لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور وہ ان سے ہلکا نہ کیا جائے گا اور وہ اس میں ناامید ہوں گے۔

وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ظالم تھے۔

وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

اور پکاریں گے اے مالک![3020] تیرا رب ہمارا کام تمام کردے۔ کہے گا تمہیں (یہیں) رہنا ہے۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾

یقیناً ہم تمہارے پاس حق لائے لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں۔

اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

کیا انہوں نے کوئی بات ٹھان رکھی ہے۔ سو ہم نے بھی ٹھان رکھی ہے۔[3021]

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

آیا سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی چھپی باتوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے۔ ہاں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے جاتے ہیں۔

3020- ﴿مٰلِكُ﴾ دوزخ کے داروغہ کا نام ہے۔ عذاب سے چھوٹنے کے لیے موت مانگتے ہیں۔ جواب میں ﴿مّٰكِثُوْنَ﴾ کا لفظ لاکر بتایا کہ ابھی ان کو اور انتظار کرنا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1887]

3021- ﴿اَبْرَمُوْۤا﴾ اِبْرَامٌ کسی معاملہ کا مضبوط کرلینا ہے اور اس کا اصل رسے کے مضبوط بٹنے سے ہے۔ (غ) ﴿اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا﴾ سے مراد ہے کہ انہوں نے اپنی مخالفت رسول کی تدبیر کو مضبوط کرلیا ہے اور ﴿فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ﴾ میں بتایا کہ ہم اس امر کا استحکام کررہے ہیں جس کے لیے رسول کو بھیجا گیا ہے۔ اگلی آیت میں بتادیا کہ ان کی شرارتوں اور تدابیر کا سد باب کردیا جائے گا۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾

کہہ، اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتو میں پہلا عبادت کرنے والا ہوں۔ (3022)

3022- اِنْ نافیہ بھی ہوتا ہے بمعنی مَا اور اکثر اس کے بعد اِلَّا آتا ہے۔ جیسے ﴿اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ﴾[الملك: 20:67] ''کافر صرف دھوکے میں ہیں۔'' ﴿اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ﴾[المجادلة: 2:58] ''ان کی مائیں صرف وہی ہیں جنہوں نے انہیں جنا۔'' ﴿اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ﴾[النسآء: 159:4] ''اہل کتاب میں کوئی نہیں مگر اس پر ضرور ایمان لاتا ہے۔'' اور بعض کا خیال ہے کہ اِنْ نافیہ سوائے اس کے آتا ہی نہیں کہ اس کے بعد اِلَّا ہو اور یہ غلط ہے۔ ﴿اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا﴾ [یونس: 68:10] ''تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں۔'' ﴿قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾[الجن: 25:72] ''کہہ میں نہیں جانتا کہ وہ جس کا تمہیں وعدہ دیا جاتا ہے قریب ہے۔'' ﴿وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ﴾[الأنبيآء: 111:21] ''اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لیے آزمائش ہے۔'' اور یہاں بھی بعض کے نزدیک اِنْ نافیہ ہے۔ (مغنی)

عیسائیوں کا عقیدہ ابنیت:

بہت سے مفسرین نے یہاں اِنْ کو نافیہ لیا ہے اور ﴿اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ کے معنی [اَوَّلُ الشَّاهِدِيْنَ] لیے ہیں۔ یا یہ کہ میں پہلا وہ شخص ہوں جو اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ اس ایمان اور تصدیق کے ساتھ کہ رحمٰن کا کوئی بیٹا نہیں۔ اور بعض نے [عَبْدِ فُلَانٌ مِنْ هٰذَ الْاَمْرِ] کے محاورہ پر جس کے معنی ہیں [اٰنِفَ مِنْهُ وَ غَضِبَ اِيَّاهُ] یعنی اس کام سے عار کی اور ناراض ہوا اور اس کا انکار کیا۔ ﴿اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ سے مراد اس کام کی عار کرنے والا یا اول انکار کرنے والا لیے ہیں۔ اور اِنْ کو اس صورت میں بمعنی لَوْ مانا ہے۔ اور بعض نے تقدیر یوں مانی ہے کہ اگر تمہارے زعم میں کوئی اللہ کا بیٹا ہے تو میں تمہاری تکذیب اور تمہاری بات کا انکار کرنے میں اول المومنین باللہ ہوں۔ (ج) اور یوں بھی معنی کیے گئے ہیں کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوتا اور کسی دلیل سے یہ ثابت ہوجاتا تو میں اس بیٹے کی سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔ کیونکہ جب میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کو ظاہر کرتا ہوں تو اس کا بیٹا ہوتا تو اس کی میں کیوں عبادت نہ کرتا۔ (ر)

ولد حقیقت پر محمول نہیں:

اور میرے نزدیک یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اگر رحمٰن کا کوئی بیٹا ہوسکتا ہے تو وہ حقیقت میں خدا یا ابن اللہ نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا کوئی بندہ اس کے اخلاق میں رنگین ہونے کی وجہ سے مجازاً اس کا بیٹا کہلا سکتا ہے۔ خود انجیل میں بھی بیٹے کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ''اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا مانگو تا کہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو۔'' اور اس طرح بیٹا کہلانے میں ایک کی کوئی خصوصیت نہیں، ساری مخلوق شریک ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ﴾[الزمر: 4:39] ''اگر اللہ چاہتا کہ بیٹا بنائے تو وہ اپنی مخلوق سے جسے چاہتا چن لیتا، بے عیب ذات ہے۔'' اس لیے فرمایا ﴿فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ﴾ میں خدا کی عبادت میں سب سے آگے

سُبۡحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۸۲﴾

آسمانوں اور زمین کا رب، رب عرش۔ اس سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔(3022)

فَذَرۡهُمۡ يَخُوۡضُوۡا وَ يَلۡعَبُوۡا حَتّٰى يُلٰقُوۡا يَوۡمَهُمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۸۳﴾

سو انہیں چھوڑ دے باتوں میں لگے رہیں اور کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو پائیں جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِىۡ فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِى الۡاَرۡضِ اِلٰهٌ ؕ وَ هُوَ الۡحَكِيۡمُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۸۴﴾

اور وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے اور وہ حکمت والا علم والا ہے۔

وَ تَبٰرَكَ الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَيۡنَهُمَا ۚ وَ عِنۡدَهٗ عِلۡمُ السَّاعَةِ ۚ وَ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾

اور وہ بابرکت ہے کہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان اسی کی بادشاہت ہے اور اسی کو (موعودہ) گھڑی کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

وَ لَا يَمۡلِكُ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾

اور وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے جنہیں یہ اس کے سوائے پکارتے ہیں۔ مگر وہ جس نے حق کی گواہی دی اور وہ (اسے) جانتے ہیں۔(3023)

ہوں۔ لیکن بیٹا کوئی نہیں ہوسکتا، کیونکہ جو بیٹا بناتے ہیں وہ اس لیے بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم نہیں کرسکتا۔ اور رحمٰن ہی ہے جو بلا بدل رحم کرتا ہے۔ پس جس خدا کی صفت رحمانیت ہے اس کا بیٹا کوئی نہیں ہوسکتا۔

3022۔ ﴿يَصِفُوۡنَ﴾ وَصَفَ کسی چیز کا بیان اس کے حلیہ اور اس کی نعت کے ساتھ کرنا ہے اور صِفَةٌ اس کی وہ حالت ہے اور وصف حق بھی ہوتا ہے اور باطل بھی۔ (غ)

3023- **شفاعت آنحضرت ﷺ**: ﴿اِلَّا مَنۡ شَهِدَ بِالۡحَقِّ﴾ حق یا توحید کی شہادت دینے والے خود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اسی لیے آگے بڑھایا ﴿وَ هُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ﴾ یعنی وہ آپ کو جانتے ہیں۔ یعنی اب جو لوگ ہیں ان کی شفاعت صرف رسول اللہ

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور اگر تو ان سے پوچھے کس نے انہیں پیدا کیا؟ تو کہیں گے اللہ نے۔ پھر کس طرح الٹے پھر جاتے ہیں۔

وَ قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وقف لازم

اور اس کی پکار (کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو ہے) کہ اے میرے رب! یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ (3024)

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَ قُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾ ع 7 22 13

سو ان سے درگزر کر اور کہہ دے سلام۔ آخر جان لیں گے۔

ﷺ ہی کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں خواہ بت ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا زمانہ گزر چکا تھا اور یہ زمانہ اتباع آنحضرت ﷺ کا تھا۔ اور آپ ہی اب شفاعت کر سکتے ہیں۔ یہاں آنحضرت ﷺ کی شفاعت کا بالتصریح ذکر کیا ہے۔

3024- ﴿وَ قِيْلِهٖ﴾ میں ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف ہے اور قِيْلِهٖ کا عطف سَاعَةِ پر ہے یعنی مراد ہے ﴿عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ و عِلْمَ ﴿قِيْلِهٖ﴾ یعنی جس طرح ساعت کا علم اللہ کو ہے اسی طرح رسول کی اس پکار کا بھی علم اللہ کو ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اور اس پکار کا علم ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کو سنتا ہے اور وہ ضرور اس کا فیصلہ کرے گا۔ اور رسول کے اس دردِ دل کی آواز پر توجہ فرمائے گا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ساعت سے مراد قوم کی ساعت وسطیٰ ہے اور قیامت کبریٰ مراد نہیں۔ اور واؤ قسم کے لیے بھی ہو سکتی ہے۔ اور جواب قسم بعض کے نزدیک ﴿اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ہے اور بعض کے نزدیک یہ سارا قول آنحضرت ﷺ کا ہے اور جواب قسم محذوف ہے یعنی لَيَنْصُرَنَّهٗ اور قِيْلَ اور قَوْلٌ کے ایک ہی معنی ہیں اور یہاں آنحضرت ﷺ کی اس پکار کی قسم کھائی ہے یعنی اسے بطور شہادت پیش کیا ہے کہ ایسا شخص جس کو اس قدر غم لوگوں کے ایمان نہ لانے کا ہے، ضرور ہے کہ اسے نصرت دی جائے۔

سورۃ الدخان

نام:

اس سورت کا نام اَلدُّخَانْ ہے اور اس میں 3 رکوع اور 59 آیتیں ہیں۔ دُخَانٌ کے عام معنی دھواں ہیں۔ مگر اس کے معنی قحط اور خشک سالی بھی آئے ہیں۔ اور اس لفظ میں اس سورت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اس میں ذکر نبی کریم ﷺ کے مخالفین کی سزا کا ہے۔ اور انہیں بتایا ہے کہ پہلے ان پر خشک سالی کے رنگ میں چھوٹا عذاب بھیجا جائے گا اور آخر ان کی طاقت بالکل توڑ دی جائے گی۔ اور چونکہ دُخَانٌ کے معنی شَرّ بھی ہیں اور ایک دخان کا ذکر [اَشْرَاطِ السَّاعَةِ] میں بھی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس زمانہ کے شرِ عظیم کی طرف بھی اشارہ ہو جس کا بڑا حصہ گزر چکا اور اس عذاب کو دور کر دیا گیا۔ مگر ﴿اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ﴾ بھی موجود ہے اور یہی آخری گرفت کے لانے کا موجب ہوگا۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں دخان کی پیشگوئی اور اس کے بعد ایک عظیم الشان گرفت کا ذکر ہے۔

② دوسرے رکوع میں بنی اسرائیل کی نجات کی خبر میں جو فرعون کے ہاتھ سے انہیں ملی مسلمانوں کو خوش خبری دی ہے اور

③ تیسرے میں بدوں اور نیکوں کی آخری جزا سزا کا ذکر کیا ہے۔

تعلق:

پچھلی سورت میں یہ ذکر تھا کہ دنیا کی زیب و زینت ظاہری کو لوگ زندگی کی اصل غرض سمجھ کر مقصد زندگی سے دور جا پڑتے ہیں۔ اس لیے اب بتایا کہ یہ ظاہری آسائش کے سامان بھی بعض وقت تھوڑی دیر کے لیے بطور تنبیہ لے لیے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ پھر بھی سبق نہ لیں ان پر آخر سخت گرفت ہوتی ہے۔

اٰيَاتُهَا 59 (44) سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ (64) رُكُوْعَاتُهَا 3

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۝۱ — (اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ — کھول کر بیان کرنے والی کتاب گواہ ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳ — ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں اتارا ہے۔ ہم ہمیشہ ڈراتے رہے ہیں۔ (3025)

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴ — ہر حکمت کی بات کا اس میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ (3026)

3025- **ابتدائے نزول قرآن:** ﴿لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ سے مراد لیلۃ القدر ہی ہے جیسا کہ دوسری جگہ صراحت سے موجود ہے ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾ [القدر: 1:97] ''ہم نے اسے لیلۃ القدر میں اتارا'' اور لیلۃ القدر رمضان میں ہے۔ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرۃ: 185:2] ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا'' گویا قرآن شریف کے نزول کی ابتدا رمضان میں لیلۃ القدر میں ہوئی اور لیلۃ القدر 25 یا 27 یا 29 رمضان میں ہے۔ اور ابن جریر کہتے ہیں کہ قرآن کریم رمضان کے چوبیس دن گزرنے کے بعد نازل ہوا۔ گویا پچیسویں رات میں اور ﴿اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ میں سنت اللہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون چلا آیا ہے کہ وہ اپنی طرف سے منذر بھیجتا رہا ہے۔

3026- **لیلۃ القدر اور اس میں قضائے امور:** یہاں مفسرین نے ﴿اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ سے مراد کسی کی زندگی اور کسی کی موت اور معائش اور مصائب اور رزق وغیرہ لیا ہے کہ ایک سال کے لیے اس رات میں فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ایسی کوئی رات ہے یا نہیں جس میں ایک سال کی قضا و قدر کا فیصلہ کر دیا جاتا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ﴿اَمْرٍ حَكِيْمٍ﴾ سے مراد کسی کا مرنا، کسی کا جینا، کسی کا رزق حاصل کرنا، کسی کا بھوکا رہنا نہیں بلکہ یہ وہ حکمت والے امور ہیں جو قرآن کریم میں ہدایت خلق کے لیے نازل ہوئے ہیں۔ اور اس بیان کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں کہ ہم نے قرآن کو ایسی رات میں اتارا جس میں لوگوں کی موت اور زندگی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ امور نہیں جن کی وجہ سے کوئی رات مبارک کہلا سکے، جیسا کہ یہاں اسے کہا گیا ہے۔ بلکہ اس کی برکت یہی ہے کہ اس میں وہ پُرحکمت باتیں نازل ہوئیں جو ہدایت و اصلاح عالم کا موجب ہوئیں۔ اور یہ بات کہ وہ تمام امور ایک ہی رات میں نازل نہیں ہوئے، محل اعتراض نہیں۔ اس لیے کہ اس پاک کتاب کا نزول جس معنی سے اس لیلۃ مبارک

اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۚ ﴿۵﴾

ہماری طرف سے حکم ہوتا ہے، ہم ہمیشہ رسول بھیجتے رہے ہیں۔

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۙ ﴿۶﴾

تیرے رب کی طرف سے رحمت ہے۔ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾

وقف لازم

آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ اور اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَ رَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾

اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے۔ تمہارا رب اور تمہارے پہلے باپ داداؤں کا رب۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾

بلکہ وہ شک میں (پڑے ہوئے) کھیلتے ہیں۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ ﴿۱۰﴾

سو اس دن کا انتظار کر جب آسمان کھلا دھواں لائے۔

يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾

وہ لوگوں کو ڈھانک لے گا یہ دردناک عذاب ہے۔ (3027)

میں صحیح ہے اسی معنی سے تمام حکمت والے امور کا کھول کر بیان کرنا بھی اس میں صحیح ہے۔ اور اس کی عام توجیہ یہ ہے کہ اس رات میں قرآن کریم کا نزول سمائے اول پر ہوگیا۔ اور دوسری یہ کہ ابتدا اس رات میں ہوئی اور تیسری توجیہ یوں بھی ہوسکتی ہے کہ ﴿لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ میں اشارہ اس سارے زمانے کی طرف ہے جس میں نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل ہوتا رہا۔ اور اسے لیلۃ اس لحاظ سے کہا ہے کہ اصل میں وہ تاریکی کا زمانہ تھا، انوار نبوت نے اسے روشن کیا۔ اگلی آیت میں ﴿اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا﴾ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، یعنی اس کتاب کا نزول اور ان امور کی تفصیل یہ ہماری جناب سے ایک حکم ہے۔

3027 - ﴿بِدُخَانٍ﴾ دُخَانٍ۔ جَدْبٌ یعنی خشک سالی مراد ہے۔ کہا گیا ہے کہ بھوکا اپنے اور آسمان کے درمیان بھوک کی شدت کی وجہ سے دھواں دیکھتا تھا، بلکہ بھوک کو دھواں کہا گیا ہے۔ کیونکہ خشک سالی میں زمین خشک ہوکر غبار اٹھتا ہے تو اس غبار کو

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

ہمارے رب ہم سے عذاب دور کر ہم ایمان لانے والے ہیں۔

اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

یہ نصیحت کہاں حاصل کریں گے اور ان کے پاس کھول کر بیان کرنے والا رسول آیا۔

دھوئیں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس لیے بھوک کے سال کو غَبْرَاءُ اور [جُوْعٌ اَغْبَرْ] کہا گیا ہے اور عرب کے لوگ دخان کو شَرّ کے موقع پر بولتے تھے جب کہ وہ بہت ہو۔(ل)

آنحضرت ﷺ کی دعا پر اہل مکہ پر قحط کا آنا:

بخاری میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہے کہ جب قریش نے آنحضرت ﷺ کی باتوں کو ماننے سے انکار کیا، تو آپ نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ یوسف کے سالوں کی طرح ان پر قحط کے سال لائے۔ پس ان پر قحط آیا اور یہ سخت مصیبت تھی یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں اور چمڑے اور مردار کھائے۔ پس ایک شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا تو بھوک کے مارے اسے اپنے اور آسمان کے درمیان ایک دھواں سا دکھائی دیتا تھا اور بعض روایات میں ہے کہ زمین سے ایک دھواں سا اٹھتا نظر آتا تھا۔ پس کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور ایک روایت میں ہے ابوسفیان آیا اور کہا، یا رسول اللہ! مضر کے لیے اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہوگئی۔ تب آپ نے بارش کی دعا کی اور بارش ہوئی۔ اور بعض روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے یہ آیت پڑھی ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ یہاں تک کہ آپ ﴿اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۘ﴾ پر پہنچے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو جو اس آیت کو عذاب قیامت کے متعلق سمجھتا تھا کہا کہ کیا قیامت کے دن یہ عذاب دور کیا جائے گا؟ اور آپ نے فرمایا ﴿الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى﴾ یوم بدر ہے۔ اور اس کے متعلق مختلف روایتیں بخاری میں ہیں اور دیگر کتب حدیث میں بھی ہیں۔ اور بعض نے اس **دخان کو نشانات قیامت میں سے قرار دیا** ہے۔ اور سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دخان قیامت کے نشانات میں سے ہے، تو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ دخان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ ﴿يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ لیکن اس حدیث پر جرح ہوئی ہے اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ثابت ہے۔ ہاں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں دوہری پیشگوئی ہے اور ایک دفعہ پوری صراحت سے وہ پوری ہوچکی ہے۔ اور دوسری دفعہ کا تعلق قرب قیامت سے ہے یعنی موجوہ زمانہ سے، اور یہاں واقعی دخان کا نظارہ اپنے دوسرے معنی کی رو سے دیکھا گیا ہے یعنی شر عظیم کے دنیا پر ظاہر ہونے سے جو گزشتہ جنگ یورپ کی صورت میں نمودار ہوئی اور اس کی صداقت حدیث سے ظاہر ہے۔ جس میں ایک شر عظیم کا ذکر ہے۔ یہ حدیث سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی ہے اور ابوداؤد میں ہے: [قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ! هَلْ بَعْدَ هَذَا الشَّرِّ خَيْرٌ؟ قَالَ: هُدْنَةٌ عَلَى دَخَنٍ]

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿۱۴﴾ وقف لازم

پھر وہ اس سے پھر گئے اور کہنے لگے سکھایا ہوا ہے، دیوانہ ہے۔ (3028)

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وقف لازم

ہم عذاب کو تھوڑی دیر کے لیے دور کر دیں گے تو پھر (انہی کی طرف) لوٹ جاؤ گے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾

جس دن ہم سخت گرفت سے پکڑیں گے۔ ہم ضرور سزا دینے والے ہیں۔ (3029)

(سنن ابو داؤد، باب: ذِكْرِ الْفِتَنِ وَدَلاَئِلِهَا، حدیث: 4248) یعنی میں نے دریافت کیا یا رسول اللہ اس شر کے بعد خیر ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: صلح ہوگی جس کے نیچے فساد ہوگا۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ اس شر سے مراد جنگ ہے اور یہ [هُدْنَةٌ عَلَى دَخَنٍ] وہی ہے جس کا نظارہ آج ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور یہاں لفظ دخن اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد اس حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا: [فِتْنَةٌ عَمْيَاءُ صَمَّاءُ] ایک ایسا فتنہ ہوگا جو سخت خطرناک ہوگا۔ اور یہ بھی یہاں سے ظاہر ہے کہ یہ قحط مکہ میں ہی شروع ہوا۔ اور روح المعانی میں ہے کہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس کا آنحضرت ﷺ کے مکی زندگی میں ہونا ہی بیان کیا ہے، مگر بعض روایات میں ہے کہ ابوسفیان کا قصہ مدینہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جس سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شاید یہ دو دفعہ ہوا ہو۔ مگر اصل بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ یہ قحط اس وقت شروع ہوا جب ابھی آپ مکہ میں ہی تھے اور ختم اس وقت ہوا جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور یہاں یہ آیات بطور پیشگوئی ہیں، جیسا کہ ﴿فَارْتَقِبْ﴾ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ ان کا نزول قحط کے ظہور سے پہلے ہوا۔

3028- ﴿مُعَلَّمٌ﴾ تعلیم دیا گیا یعنی وہ جسے کوئی دوسرا سکھاتا ہے۔ ﴿اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ [النحل: 103:16] ''اسے تو ایک انسان سکھاتا ہے۔'' یہ بعض عجمی غلام تھے جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے اور کفار کہتے تھے کہ یہی لوگ آپ کو سکھاتے ہیں۔ ان کی اس درخواست پر یعنی ﴿رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾﴾ پر فرمایا ﴿اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى﴾ عذاب کے ٹل جانے سے یہ نصیحت کہاں حاصل کرنے والے ہیں۔ کیونکہ مخالفت میں اس قدر دور نکل چکے ہیں کہ کبھی جھوٹے الزامات لگاتے ہیں کہ آپ کو دوسرے سکھاتے ہیں اور کبھی مجنون کہتے ہیں۔ حالانکہ جانتے ہیں کہ دونوں باتیں غلط ہیں اور عذاب کے دور ہونے کی درخواست انہوں نے رسول کریم ﷺ کے ذریعہ سے ہی کی تھی۔ جیسے کہ پچھلی سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کیے جانے کا ذکر ہے۔ [الزخرف: 49:43]

3029- ﴿الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى﴾ سے مراد بھی عذاب دنیا ہی ہے جیسا کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے یوم بدر قرار دیا ہے اور اکثر مفسرین

وَ لَقَدۡ فَتَنَّا قَبۡلَهُمۡ قَوۡمَ فِرۡعَوۡنَ وَ جَآءَهُمۡ رَسُوۡلٌ كَرِيۡمٌ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو آزمایا اور ان کے پاس معزز رسول آیا۔

اَنۡ اَدُّوۡۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیۡ لَكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ﴿۱۸﴾

کہ اللہ کے بندوں کو میرے سپرد کر دو، میں تمہارے لیے امانت والا رسول ہوں۔ (3030)

وَّ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیۡۤ اٰتِيۡكُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ۚ ﴿۱۹﴾

اور کہ اللہ کے مقابل سرکشی اختیار نہ کرو، میں تمہارے پاس کھلی دلیل لایا ہوں۔

وَ اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَ رَبِّكُمۡ اَنۡ تَرۡجُمُوۡنِ ﴿۲۰﴾

اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ مانگتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کرو۔

وَ اِنۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا لِیۡ فَاعۡتَزِلُوۡنِ ﴿۲۱﴾

اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ ہو جاؤ۔

کا یہی قول ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہو۔ ﴿الۡبَطۡشَةَ الۡكُبۡرٰى﴾ کا لفظ اس پر زیادہ صادق آتا ہے، کیونکہ ایک تو اس میں حملے کا رنگ ہے اور دوسرے اس سے ان کی قوت کا کلی استیصال ہو گیا اور پھر وہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ اور ﴿كَاشِفُوا الۡعَذَابِ قَلِيۡلًا﴾ صاف بتاتا ہے کہ ﴿الۡبَطۡشَةَ الۡكُبۡرٰى﴾ قحط کے ختم ہونے کے کچھ مدت بعد ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ابتدا اس کی جنگ بدر سے ہے۔

3030 - ﴿اَدُّوۡۤا﴾ ﴿اَدَآءٌ﴾ کسی حق کا ایک ہی دفعہ اور پورا پورا دے دینا اور امانت کا واپس کرنا ہے۔ ﴿فَلۡيُؤَدِّ الَّذِی اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ [البقرۃ: 283:2] ''تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے چاہیے کہ وہ امانت کو ادا کرے۔'' ﴿اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهۡلِهَا﴾ [النسآء: 58:4] ''امانتیں ان کے اہل کو ادا کرو۔'' ﴿وَ اَدَآءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ﴾ [البقرۃ: 178:2] ''اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔'' اور یہاں مراد ہے کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے آزاد کر کے میرے سپرد کر دو اور اس کے لیے ادائے امانت کا لفظ استعما کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا کسی وقت دوسری قوم کے ماتحت ہونا محض ایک امانت ہے اور **دوسری قوم کو غلام بنانا کسی کا حق نہیں**۔ اور دوسری جگہ ہے ﴿فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۬ؕ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ﴾ [طٰہٰ: 47:20] ''سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں دکھ نہ دے۔'' اور بعض نے عباد اللہ کو منادی قرار دے کر یوں معنی کیے ہیں کہ اے بندگان خدا! حق اللہ کو جو ایمان اور قبول دعوت ہے میری طرف ادا کرو۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ مُّجۡرِمُوۡنَ ﴿۲۲﴾ سواس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں۔

الثالثۃ

فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلًا اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ ﴿۲۳﴾ تو میرے بندوں کو رات کے وقت لے جا، تمہارا پیچھا کیا جائے گا۔

وَ اتۡرُکِ الۡبَحۡرَ رَهۡوًا ؕ اِنَّهُمۡ جُنۡدٌ مُّغۡرَقُوۡنَ ﴿۲۴﴾ اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔ یہ ایک لشکر ہے جو غرق کیے جائیں گے۔(3031)

کَمۡ تَرَکُوۡا مِنۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۲۵﴾ کتنے باغ اور چشمے چھوڑ گئے۔

وَّ زُرُوۡعٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیۡمٍ ﴿۲۶﴾ اور کھیتیاں اور عزت والے مقام۔

وَّ نَعۡمَۃٍ کَانُوۡا فِیۡهَا فٰکِهِیۡنَ ﴿۲۷﴾ اور نعمتیں جن میں مزے سے رہتے تھے۔(3032)

3031- [رَهَا الشَّیْءُ رَهْوًا] کے معنی ہیں سَکَنَ یعنی وہ چیز حالت سکون میں ہوئی۔ اور ہر ایک ساکن جو حرکت نہ کرے اسے رَهْوٌ کہا جاتا ہے اور جب کہیں [اِفْعَلْ كَذَا رَهْوًا] تو مراد ہوتی ہے [سَاكِنًا عَلٰی هَيْئَتِكَ] یعنی ٹھہر کر آہستگی سے اور [رَهَا الْبَحْرُ] کے معنی ہیں سَکَنَ یعنی ساکن ہوگیا۔ اور زجاج کہتے ہیں یہاں معنی يَبَسٌ یا خشک ہیں۔ ایک قول ہے کہ ﴿رَهْوًا﴾ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صفت ہے، یعنی آہستگی سے۔ (ل)

سمندر کو ساکن چھوڑ دے۔ الفاظ کے معنی تو یہی درست ہیں مگر سمندر کے ساکن ہونے سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ اس کا پانی پتھر بن جائے بلکہ پانی میں تموج کا نہ ہونا اس کا ساکن ہونا ہے۔ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گزرنے کے وقت سمندر سکون کی حالت میں تھا اور یوں اپنی جگہ سے پیچھے ہٹا ہوا تھا اس لیے خشک رستہ نکل آیا تھا۔ اسی سمندر میں جب تموج پیدا ہوا تو اس نے خشک جگہ کو ڈھانک لیا اور یوں لشکر فرعون غرق ہوگیا۔ یہی اصل حقیقت فلق بحر کی ہے۔

3032- ﴿نَعۡمَۃٍ﴾ نِعْمَةٌ حالت حسنہ کا نام ہے اور نِعْمَةٌ۔ تَنَعُّمٌ یعنی فراخی یا آسودگی ہے۔ (غ) اور ﴿فٰکِهِیۡنَ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 2754]

كَذٰلِكَ ۟ وَ اَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ ﴿۲۸﴾

ایسا ہی (اب) ہوگا اور ہم نے ان (چیزوں) کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا۔(3033)

فَمَا بَكَتۡ عَلَيۡهِمُ السَّمَآءُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَا كَانُوۡا مُنۡظَرِيۡنَ ﴿۲۹﴾ ع

سو ان پر آسمان اور زمین نہ روئے اور نہ انہیں مہلت دی گئی۔(3034)

ع 1 29 14

وَ لَقَدۡ نَجَّيۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنَ الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ ۙ﴿۳۰﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو رسوا کرنے والے عذاب سے نجات دی۔

3033- **بنی اسرائیل کو نعمتوں کا عطا کیا جانا:** ﴿قَوۡمًا اٰخَرِيۡنَ﴾ سے مراد یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان ہلاک ہونے والوں کے بعد دوسرے لوگ (جو بنی اسرائیل نہ تھے) ان چیزوں کے وارث ہوئے اور اس سے مراد بنی اسرائیل لے کر یوں بھی معنی ہوسکتے ہیں کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو نعمت اور دولت سے محروم کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو جنہیں وہ ذلیل کرنا چاہتا تھا اس قسم کی نعمتیں جو فاتح اور زندہ قوموں کو ملتی ہیں دیں۔ اس صورت میں ﴿اَوۡرَثۡنٰهَا﴾ سے مراد یہ ہوگی کہ ایسی نعمتوں کا انہیں اپنی جگہ پر وارث بنایا۔ کیونکہ بنی اسرائیل مصر میں واپس نہیں گئے۔

3034- ﴿بَكَتۡ﴾ ﴿بُكَآءُ﴾ کا استعمال اس حالت پر ہے جب غم کی وجہ سے آنسوؤں کے جاری ہونے کے ساتھ آواز غالب ہو اور بُکًی اس کا اس حالت پر جب حزن غالب ہو اور بُکًی کا استعمال غم اور آنسوؤں کے بہنے دونوں کے اجتماع پر بھی ہوتا ہے۔ اور ہر ایک الگ الگ بھی جیسا کہ ﴿فَلۡيَضۡحَكُوۡا قَلِيۡلًا وَّ لۡيَبۡكُوۡا كَثِيۡرًا﴾ [التوبة: 82:9] ''سو تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں۔'' میں اشارہ خوشی اور غم کی طرف ہے۔ اور بَاکِیٌ (رونے والا) کی جمع بَاکُوۡنَ بھی ہے۔ اور بُکِیٌّ بھی ﴿خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا﴾ [مریم: 58:19] ''وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔'' اور بُکِیٌّ کا اصل فعول ہے جیسے سَاجِدٌ کی جمع سُجُوۡدٌ ہے اور یہاں آسمان کے رونے سے مراد بعض نے جو آسمان کی زندگی اور علم کے قائل ہیں حقیقت لی ہے اور بعض کے نزدیک یہ مجاز ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے کہ اہل سماء ان پر نہیں روئے۔ (غ)

آسمان اور زمین کا رونا:

سیدنا ابن عباس ﷺ نے اس کے معنی یوں کیے ہیں کہ قوم فرعون نے نہ تو زمین میں کوئی اچھے آثار چھوڑے اور نہ ان کا کوئی نیک عمل آسمان پر چڑھا۔ پس نہ زمین ان پر روئی نہ آسمان۔ (ج) گویا ان کا رونا ایک اچھی چیز کے نہ پایا جانے پر اظہار غم ہے۔ مومن جب فوت ہوتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ کے رک جانے کی وجہ سے آسمان اور زمین اظہار غم کرتے ہیں اور کافر کے لیے ایسا نہیں ہوتا۔ اور ایک حدیث کا مضمون بھی اس کے قریب قریب ہے۔

مِنْ فِرْعَوْنَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۱﴾

(یعنی) فرعون (کے ہاتھ) سے، وہ سرکش حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا۔

وَ لَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۚ﴿۳۲﴾

اور ہم نے انہیں (اپنے) علم کی بنا پر قوموں پر برگزیدہ کیا۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿۳۳﴾

اور ہم نے انہیں نشانیوں میں سے وہ کچھ دیا جس میں کھلا انعام تھا۔[3035]

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ۙ

یہ کہتے ہیں،

اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَ مَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿۳۵﴾

کچھ نہیں، مگر ہماری پہلی موت ہی ہے اور ہم پھر اٹھائے نہیں جائیں گے۔[3036]

فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۶﴾

سو ہمارے باپ داداؤں کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو۔

3035- چونکہ یہاں بنی اسرائیل کو فضیلت اور انعام دینے کا ذکر ہے اس لیے ﴿بَلٰٓؤٌا﴾ سے مراد بھی انعام ہی ہے۔[دیکھو نمبر: 72] اور آیات سے مراد ایسی نشانیاں ہیں جیسے سمندر سے پار کرنا اور ان کے دشمنوں کو تباہ کرنا۔ بادل کا سایہ، من وسلویٰ اور توریت بھی مراد ہو سکتی ہے۔

3036- **موت اولیٰ سے مراد:** جیسا کہ خود ان کے اس قول سے ظاہر ہے وہ دوسری زندگی کے قائل نہ تھے۔ پس ﴿مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى﴾ کے الفاظ ان کی طرف کیوں منسوب کیے اور فی الحقیقت بھی دوسری موت تو کوئی ہے ہی نہیں۔ ہاں قرآن شریف نے پہلی نیستی پر موت کا لفظ استعمال کیا۔ ﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ﴾ [البقرة: 28:2] ''تم مردہ تھے پھر اس نے تمہیں زندگی دی۔'' اصل یہ ہے کہ موت اولیٰ یا پہلی موت سے مراد وہ موت ہے جو حیات اولیٰ یعنی پہلی زندگی کا خاتمہ کرتی ہے۔ گویا وہ جب دوسری زندگی کا انکار کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو مر جائیں گے اور اس موت کے بعد جو اس پہلی زندگی کا خاتمہ کر دے گی کوئی دوسری زندگی نہیں۔

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۳۷﴾

کیا یہ اچھے ہیں یا تبع کی قوم؟ اور وہ جو ان سے پہلے تھے۔ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، کیونکہ وہ مجرم تھے۔ (3037)

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔

مَا خَلَقْنٰهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾

ہم نے انہیں حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ۙ

فیصلے کا دن ان سب کا وقت مقرر ہے۔

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ۙ

جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

3037 - ﴿قَوْمُ تُبَّعٍ﴾ تفسیر میں ہے کہ تُبَّعْ بادشاہ تھا اور مومن تھا اور اس کی قوم کافر تھی اور اور بھی تُبَّعٍ ہوئے ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ یمن کا بادشاہ تھا اور شاہ یمن کو تُبَّعٍ نہیں کہتے، سوائے اس کہ وہ حضر موت اور سبا اور حمیر کا مالک ہو۔ (ل) اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسے مومن قرار دیا ہے۔ (ج) اور بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تُبَّعٍ کو برا مت کہو اور بعض روایات میں ہے کہ وہ سمرقند فتح کر کے واپس آیا تو لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ وہ خانہ کعبہ کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا بلکہ خانہ کعبہ کا حج کیا۔ اور بعض تواریخ میں ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سات سو یا ہزار سال پہلے ہوا۔ اور ابن مردویہ نے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے اس میں ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاتا تھا۔ (ر) تُبَّعْ کا ذکر صرف ایک جگہ اور آتا ہے ﴿وَّ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَ قَوْمُ تُبَّعٍ﴾ [ق: 14:50] ''اور بن کے رہنے والوں اور تبع کی قوم نے۔'' جہاں اس قوم کا ذکر مکذبین رسل میں کیا۔ پس ممکن ہے کہ وہ بھی رسولوں میں سے ہو۔ اور روح المعانی میں ہے کہ ایک اور روایت میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا نبی ہونا بیان کیا گیا ہے، گو اس کی صحت ثابت نہیں۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ	سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے۔ بیشک وہ غالب رحم
ع 2 13 15 الرَّحِيْمُ ﴿٤٢﴾	کرنے والا ہے۔
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿٤٣﴾	بے شک زقوم کا درخت
مُعَانَقَة 14 طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿٤٤﴾	گناہ گار کا کھانا ہے۔
كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿٤٥﴾	پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں کھولے گا۔
كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٦﴾	ابلتے ہوئے پانی کے کھولنے کی مانند۔
خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٤٧﴾	اسے پکڑلو، پھر اسے دوزخ کے درمیان کھینچ لے جاؤ۔(3038)
ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٨﴾	پھر اس کے سر کے اوپر ابلتے ہوئے پانی کا عذاب ڈالو۔
ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿٤٩﴾	چکھ، تو زبردست معزز تھا۔(3039)
اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾	یہ وہ ہے جس پر تم جھگڑتے تھے۔
اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿٥١﴾	متقی امن کی جگہ میں ہوں گے۔

3038- ﴿فَاعْتِلُوْهُ﴾ اِعْتِلُوْهُ۔ عَتْلٌ کے معنی ہیں سختی سے کھینچنا یا سختی سے لے جانا جیسے [عَتَلْتُهُ اِلَى السِّجْنِ] اور عُتُلّ کے معنی ہیں سخت، بدخلق، بہت کھانے والا، سخت جھگڑالو ﴿عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿١٣﴾﴾ [القلم: 13:68] ''سخت جھگڑالو، اس کے علاوہ شرارت میں مشہور (ہے)۔'' (ل)

3039- ﴿اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ﴾ یا تو یہ مراد ہے کہ تو اپنے آپ کو عزیز کریم کہتا تھا یا سمجھتا تھا حالانکہ فی الواقع ایسا نہ تھا۔ اور یا یہ کہ تو اپنی قوم میں عزیز کریم تھا مگر وہ تیری دنیوی عزت و وجاہت اب کسی کام نہیں آسکتی اور نہ عذاب سے بچا سکتی ہے۔ اور یہاں دوزخ کے عذاب کے ذکر میں بتایا ہے کہ یہ عذاب انسان کے اندر بھی ہوگا اور باہر سے بھی ہوگا۔

فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۚ﴿۵۲﴾

(یعنی) باغوں اور چشموں میں۔

يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۚ﴿۵۳﴾

باریک اور موٹا ریشم پہنیں گے، ایک دوسرے کے سامنے (بیٹھیں گے)۔

كَذٰلِكَ ۫ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ؕ﴿۵۴﴾

ایسا ہی ہوگا، اور ہم انہیں خوبصورت حوروں کے ساتھی بنا دیں گے۔ (3040)

3040- ﴿زَوَّجْنٰهُمْ﴾ زَوْجٌ بمعنی قرین بھی آتا ہے یعنی ساتھی اور شبیہ بھی ﴿اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ [طٰہٰ: 131:20] ''جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔'' جس سے مراد اشباہ و اقران ہیں ایسا ہی ﴿اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ﴾ [الصافات: 22:37] ''اکٹھا کرو انہیں جو ظلم کرتے تھے اور ان کے ساتھیوں کو۔'' میں مراد اقران ہیں۔ [وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ أَىْ قَرَنَّاهُمْ بِهِنَّ وَلَمْ يُجِئْ فِي الْقُرْآنِ زَوَّجْنَاهُمْ حُوْرًا كَمَا يُقَالُ زَوَّجْتُهُ اِمْرَأَةٍ تَنْبِيْهًا أَنَّ ذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ عَلٰى حَسَبِ الْمُتَعَارِفِ فِيْمَا بَيْنَنَا مِنَ الْمُنَاكِحَةِ....](المفردات فی غریب القرآن، کتاب الحاء) یعنی یہاں زوجنا سے مراد حور کو ان کا قرین بنا دینا ہے اور قرآن شریف میں کہیں [زَوَّجْنَاهُمْ حُورًا] نہیں آیا۔ جس طرح پر [زَوَّجْتُهُ اِمْرَأَةٍ] کہہ دیا جاتا ہے یعنی میں نے عورت کو اس کے نکاح میں دے دیا۔

بہشت میں زوج کا تعلق:

اور یہ تنبیہ ہے اس بات پر کہ بہشت میں یہ تعلق اس قسم کا نہیں ہوگا جیسا ہمارے درمیان عورت اور مرد کے نکاح میں متعارف ہے۔ (غ)

﴿بِحُوْرٍ﴾ حَوْرٌ اور حَوْرَاءٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 441] اور حُوْر۔ اَحْوَر اور حَوْرَا دونوں کی جمع ہے۔ (غ) اور عِيْن، اَعْيَن اور عَيْنَاءٌ دونوں کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 2785] اور وہیں یہ بحث مفصل گزر چکی ہے کہ حُوْر نعمائے جنت میں سے ایک نعمت ہے، جو مردوں کے لیے بھی ہے اور عورتوں کے لیے بھی۔ اور زَوْجٌ کی بحث میں امام راغب نے اس بات کو صاف کر دیا ہے کہ حُوْر کے ساتھ تزویج مناکحت کے رنگ میں نہیں بلکہ قرین کے رنگ میں ہے اور مزید براں یہ کہ حُوْر اور عِيْن دونوں لفظ مذکر کی جمع بھی ہیں اور مؤنث کی بھی۔ اور اگرچہ یہ الفاظ ایسے ہیں جو عورتوں کے لیے عام طور پر استعمال ہوتے ہیں مگر مراد اس سے فی الواقع عورتیں نہیں ہو سکتیں۔ جیسا کہ [نمبر: 2785] میں دکھایا جا چکا ہے۔ کیونکہ نعمائے بہشتی میں نام بیشک اس دنیا کے ہیں گو ان چیزوں کی اصل حقیقت وہ نہیں۔ اور اصل غرض صرف کمال حسن کو ظاہر کرنا ہے جو انسان کے حسن اعمال کا نتیجہ ہے، مگر اس عالم میں ایک نیا رنگ اختیار کر لیتا ہے جس کی حقیقت کو ہم اس عالم میں نہیں سمجھ سکتے۔

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۙ﴿۵۵﴾

اس میں حالت امن میں ہر قسم کے پھل منگوائیں گے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۙ﴿۵۶﴾

اس میں کوئی موت نہیں چکھیں گے سوائے پہلی موت کے (جو چکھ چکے) اور اس نے انہیں دوزخ کے عذاب سے بچا دیا۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾

تیرے رب کی طرف سے فضل ہے، یہی بڑی کامیابی ہے۔

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾

سو ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

ع 3 17 16 فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

پس انتظار کر کہ وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں۔

اٰيَاتُهَا 37 (45) سُوۡرَةُ الۡجَاثِيَةِ مَكِّيَّةٌ (65) رُكُوۡعَاتُهَا 4

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾

(اللہ تعالیٰ) بے انتہا رحم والا۔

تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۲﴾

کتاب کا اتارنا اللہ غالب حکمت والے کی طرف سے ہے۔

اِنَّ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ﴿۳﴾

یقیناً آسمانوں اور زمین میں مومنوں کے لیے نشان ہیں۔

وَ فِىۡ خَلۡقِكُمۡ وَ مَا يَبُثُّ مِنۡ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۙ﴿۴﴾

اور تمہاری پیدائش میں اور اس میں جو وہ جانوروں سے پھیلا تا رہتا ہے ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔

وَ اخۡتِلَافِ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَاَحۡيَا بِهِ الۡاَرۡضَ

اور رات اور دن کے اختلاف میں اور اس میں جو اللہ بادل سے رزق اتارتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت

سورۃ الجاثیہ

نام:

اس سورت کا نام اَلۡجَاثِيَةِ ہے اور اس میں 4 رکوع اور 37 آیتیں ہیں۔ اس میں وحی الٰہی کی حقانیت اور جزا و سزا کے حق ہونے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور ان کی صداقت کے انکار پر سزا کا ذکر ہے اور اسی لحاظ سے اس کا یہ نام بھی ہے جس کے معنی ہیں گھٹنوں کے بل بیٹھنے والی (جماعت) یعنی جزا و سزا کے خوف یا اہوال قیامت کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتیں خدا کے حضور عاجز ہوں گی۔

بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۵

کے بعد زندہ کرتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ (3041)

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝۶

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ پس اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔ (3042)

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝۷ۙ

افسوس ہر جھوٹے گنہگار پر۔

يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۸

وہ اللہ کی آیتوں کو سنتا ہے (جو) اس پر پڑھی جاتی ہیں۔ پھر تکبر کرتا ہوا اڑ جاتا ہے، گویا کہ انہیں سنا ہی نہیں۔ سو اسے دردناک عذاب کی خبر دے۔ (3042ا)

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا ِۨاتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹ؕ

اور جب ہماری آیتوں سے کسی کا علم اسے ہوتا ہے، تو اس پر ہنسی کرتا ہے۔ یہی ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

3041- ﴿رِّزْقٍ﴾ سے مراد یہاں پانی ہے جو بادل سے برستا ہے۔ اس میں اور اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان تمام امور میں یہ نشان ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اپنی صفت رحمانیت سے یہ سارے سامان پیدا کیے، اسی طرح کتاب کا اتارنا بھی صفت رحمانیت کا تقاضا تھا۔

3042- ﴿بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ﴾ سے مراد ہے [بَعْدَ حَدِيْث اللّٰهِ وَ آيَاتِهٖ] یعنی اللہ کی بات یا قرآن کریم کے بعد اور اس کے نشانات کے بعد جن کی طرف اوپر توجہ دلائی گئی ہے۔

3042ا- ﴿اَلِيْمٍ﴾ اَلَمٌ وجع شدید یا سخت درد کو کہا جاتا ہے۔ اَلِمَ يَاْلَمُ۔ ﴿فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ﴾ [النسآء: 104:4] ''تو جس طرح تم دکھ اٹھاتے ہو وہ بھی دکھ اٹھاتے ہیں۔'' اور ﴿اَلِيْمٍ﴾ بمعنی مُوْلِمٌ ہے یعنی درد دینے والا۔ (غ)

مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٠

ان کے آگے دوزخ ہے اور جو کچھ انہوں نے کمایا ان کے کسی بھی کام نہ آئے گا اور نہ وہ جو انہوں نے اللہ کے سوائے حمایتی بنائے ہیں، ان کے لیے بھاری عذاب ہے۔

هٰذَا هُدًى ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝١١ ع 1 11 17

یہ ہدایت ہے اور جو لوگ اپنے رب کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے شدید قسم کا دردناک عذاب ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝١٢

اللہ وہ ہے جس نے سمندر تمہارے کام میں لگایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝١٣

اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (فضل سے) تمہارے کام پر لگایا، اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔ (3043)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝١٤

انہیں کہہ دے جو ایمان لائے ہیں کہ ان سے جو اللہ کی (نعمتوں کے) دنوں کی امید نہیں رکھتے درگزر کریں، تاکہ وہ ایک قوم کو اس کے مطابق بدلہ دے جو وہ کماتے ہیں۔ (3044)

3043 - ﴿مِنْهُ﴾ میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ یعنی ان سب چیزوں کا مسخر کر کے انسان کے کام میں لگا دینا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

3044 - **مومنوں کا کفار کو معاف کر دینا حکم قتال سے منسوخ نہیں:** ﴿اَيَّامَ اللّٰهِ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 524] یہاں ﴿يَرْجُوْنَ﴾ ساتھ لا کر جس کا اقتضا خوش کرنے والی بات ہے بتا دیا ہے کہ ان الفاظ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دن ہیں اور مطلب یہ ہے کہ

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

جو کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اپنی جان (کی بھلائی) کے لیے ہے اور جو برا کرتا ہے تو اسی پر (اس کا نقصان) ہے۔ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ۚ

اور یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی اور انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور انہیں قوموں پر فضیلت دی۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْۤا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾

اور ہم نے انہیں اس معاملہ کے متعلق کھلی دلیلیں دیں۔ سو انہوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس کے حسد کی وجہ سے۔ تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن ان باتوں میں فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ (3045)

کافر یہ توقع نہیں رکھتے کہ نیکی کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انعام ملتا ہے، اس لیے نیکی کرنے والوں کو دکھ بھی دیتے ہیں۔ پس مومنوں کو حکم دیا کہ ان تکالیف پر ان کو معاف کرتے رہیں۔ اس قسم کی تکلیف اذن قتال سے منسوخ نہیں۔ کیونکہ اذن قتال کفار سے پہلے جنگ کرنے پر ہے اور جنگ کو چھوڑ کر بہتیری تکلیفیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مکہ میں جنگ نہ تھی مگر یہ تکالیف بے انتہا تھیں، ان سب پر معافی کا حکم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان سورتوں کا نزول تکالیف کے زمانہ کا ہے۔

3045- ﴿الْاَمْرُ﴾ سے مراد یہاں بعض نے دین لے کر [بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ] سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات لیے ہیں مگر اس کا یہاں کوئی موقعہ نہیں۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مراد [اَمْرُ النَّبِيِّ ﷺ] لیا ہے یعنی آنحضرت ﷺ کے دنیا میں ظاہر ہونے کا معاملہ۔ (ر) تو اس صورت میں [بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ] سے مراد آنحضرت ﷺ کے متعلق کھلی دلیلیں ہوں گی۔ یعنی وہ پیشگوئیاں اور نشانات جو بنی اسرائیل کی کتاب میں موجود تھے۔ اور یہاں اختلاف سے مراد بھی آنحضرت ﷺ سے اختلاف مراد ہے۔ اور اگلی آیت میں ﴿الْاَمْرُ﴾ کا لفظ آنحضرت ﷺ کے متعلق لا کر صاف بتا دیا کہ یہی مراد ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾

پھر ہم نے تجھے اس معاملہ میں ایک کھلے رستہ پر لگا دیا، سو اس کی پیروی کر اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے۔ (3046)

اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾

وہ اللہ کے سامنے تیرے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور ظالم ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور اللہ (تعالیٰ) متقیوں کا مددگار ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

یہ لوگوں کے لیے روشن دلیلیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو یقین کرتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع 2 10 18

آیا وہ لوگ جو بدیاں کماتے ہیں گمان کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں (یعنی) ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہے۔ برا ہے جو یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ (3047)

وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تاکہ ہر جان کو اس کے مطابق بدلہ دیا جائے جو اس نے کمایا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

3046- ﴿شَرِيْعَةٍ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 834] اور ﴿الْاَمْرِ﴾ یا اس معاملہ سے مراد دین ہی ہے۔

3047- یعنی نیکوں اور بدوں کی زندگی اور موت کا یکساں ہونا گمان باطل ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس زندگی میں بھی نیکی کرنے والے بدوں پر ممتاز ہو جاتے ہیں۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

تو کیا تُو نے دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنایا اور اللہ نے اسے (اپنے) علم کی بنا پر گمراہ ٹھہرایا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ پس اللہ کے بعد کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔ تو کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟ (3048)

وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

اور کہتے ہیں یہ کچھ نہیں مگر ہماری دنیا کی زندگی ہے۔ ہم مرتے ہیں اور ہم جیتے ہیں اور سوائے زمانہ کے ہمیں کوئی ہلاک نہیں کرتا اور انہیں اس کا کچھ علم نہیں۔ وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔ (3049)

3048- یہاں اصل ذکر تو کفار کا ہی ہے اور انہی کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اپنے حرص و ہوا کو معبود بنا رکھا ہے۔ مگر اصل غرض مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگے رہنا یہ بھی شرک ہے۔ گو بہت سے لوگ اس شرک خفی کو دیکھ نہ سکتے ہوں۔ بلکہ یہ شرک ایسا خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتا ہے ﴿اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ﴾ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ شدہ قرار دیتا ہے جو بجائے احکام خدا کی پیروی کے اپنی خواہشات کی پیروی میں لگ جاتا ہے اور اس کے دل وغیرہ پر مہر لگا دیتا ہے۔ آج گو مسلمان بت پرستی سے بچے ہوئے ہوں، مگر یہ شرک خفی یا اپنے حرص و ہوا کا اتباع ان میں بھی پایا جاتا ہے۔

3049- ﴿الدَّهْرُ﴾ دَهْر اصل میں عالم کی کل مدت ہے، اس کے ابتدائے وجود سے لے کر اس کے خاتمہ تک۔ ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ [الدهر: 1:76] ''یقیناً انسان پر زمانے کا ایک وقت آچکا ہے۔'' پھر ہر لمبی مدت پر بولا جاتا ہے اور زَمَانٌ تھوڑی اور لمبی مدت دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور کسی شخص کا دَهْر اس کی مدت حیات ہے اور جو بات زندگی بھر باقی رہے اسے بھی دَهْر کہہ دیتے ہیں۔ اور آنحضرت ﷺ کی حدیث میں ہے: [لاَ تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ] (صحیح مسلم، كتاب الألفاظ من الأدب، باب: النَّهْيِ عَنْ سَبِّ الدَّهْرِ، حديث: 6003) تو اللہ کے دَهْر ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ خیر و شر جو لوگ زمانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور یہاں مراد زمانہ ہی ہے۔ (غ)

تناسخ:

﴿نَمُوْتُ وَ نَحْيَا﴾ میں مفسرین نے بہت سی توجیہات کی ہیں۔ بعض مرجاتے ہیں، بعض جیتے ہیں۔ یا ایک نسل مرجاتی ہے تو اس کی

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان پر ہماری کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کی دلیل اور کچھ نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارے باپ داداؤں کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع 3 5 19

کہہ، اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر وہی تمہیں مارے گا، پھر وہ تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (3050)

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور اللہ کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور جس وقت (موعودہ) گھڑی قائم ہوگی اس وقت (حق کو) باطل قرار دینے والے گھاٹے میں ہوں گے۔

وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۛ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

اور تو ہر ایک امت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا، ہر ایک امت اپنی کتاب کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تمہیں وہی بدلہ دیا جائے گا جو تم عمل کرتے تھے۔ (3051)

جگہ دوسری نسل لے لیتی ہے۔ یا نموت میں حالت عدم کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایک مراد یہ بھی لی گئی ہے کہ اس سے اشارہ تناسخ کی طرف ہے۔ یعنی ایک جسم پر موت آتی ہے تو کسی دوسرے جسم میں زندہ ہو جاتے ہیں۔ (ر) اور دَھْر کے ہلاک کرنے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح ہر چیز ایک مدت کے بعد ہلاک ہو جاتی ہے اور اس کا کچھ نشان نہیں رہتا، یہی ہماری حالت ہے۔

3050 - اِلٰی بمعنی فِیْ بھی ہو سکتا ہے یعنی قیامت کے دن جمع کرے گا اور اصل معنی لے کر انتہا بھی مراد ہو سکتی ہے۔

3051 - گھٹنوں کے بل بیٹھا ہونے میں اشارہ اس دن کے شدائد کی طرف ہے۔ اور یہ حالت اس شخص کی ہے جو حساب کتاب کے انتظار میں خائف ہے اور امت کا لفظ لانے میں شاید یہ اشارہ ہے کہ ہر نبی کی امت کا حساب اسی تعلیم کے لحاظ سے ہوگا جو اس نبی کی وساطت سے دی گئی۔ پھر ہر امت میں سے نیک و بد الگ ہو جائیں گے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں حق کے ساتھ بولتی ہے۔ ہم لکھ لیتے تھے جو کچھ تم عمل کرتے تھے۔ (3052)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾

سو وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں، تو انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یہ کھلی کامیابی ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

اور جو کافر ہیں (انہیں کہا جائے گا) کیا میری آیتیں تم پر پڑھی نہ جاتی تھیں۔ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے۔

وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾

اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ سچ ہے اور (موعودہ) گھڑی میں کچھ شک نہیں، تم کہتے ہم نہیں جانتے وہ گھڑی کیا ہے؟ ہم کو ایک خیال سا آتا ہے اور ہمیں یقین نہیں۔ (3053)

3052 - **نامۂ اعمال کی گویائی:** یہاں سے معلوم ہوا کہ نامۂ اعمال کو گویائی دی جائے گی (اور کہیں ہے کہ اس کا وزن کیا جائے گا اور کہیں ہے اِقْرَاْ كِتٰبَكَ) تو گویا بغیر پڑھنے کے ہی وہ بتادے گا کہ کیا عمل ہیں۔ اس قسم کے الفاظ صاف بتاتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہاں حال سے ہوگا نہ قال سے۔ نیز [دیکھو نمبر: 2457]

3053 - ﴿بِمُسْتَيْقِنِيْنَ﴾ مُسْتَيْقِنِيْنَ اَيْقَنَ اور اِسْتَيْقَنَ کے ایک ہی معنی ہیں [دیکھو نمبر: 150] ﴿وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ [الذاريات: 20:51] ''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشان ہیں۔'' اور ﴿مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا﴾ [النسآء: 157:4] ''انہوں نے اسے یقینی طور پر قتل نہیں کیا۔'' میں معنی ہیں [مَا قَتَلُوْهُ قَتْلًا تَيَقَّنُوْهُ بَلْ اِنَّمَا حَكَمُوْا تَخْمِيْنًا وَوَهْمًا]

وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور ان کے لیے ان کی برائیاں ظاہر ہوگئیں جو وہ عمل کرتے تھے اور انہیں اس چیز نے آلیا جس پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور کہا جائے گا آج ہم تمہاری پروا نہیں کرتے، جس طرح تم نے ہماری اس دن کی ملاقات کی پروا نہ کی۔ اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہ ہوگا۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۳۵﴾

یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیتوں کو ہنسی بنایا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکہ دیا۔ سو آج وہ اس سے باہر نہیں نکالے جائیں گے اور نہ انہیں گناہ بخشوانے کا موقع دیا جائے گا۔

فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾

پس اللہ کے لیے ہی سب تعریف ہے (جو) آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، سب جہانوں کا رب (ہے)۔

وَ لَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۷﴾ ع 4 11 20

اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں بڑائی ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

(غ) اسے ایسا قتل نہیں کیا جس پر انہیں یقین ہو گیا ہو کہ قتل ہو گیا۔ بلکہ اٹکل سے اور خیال سے حکم لگا دیا (کہ قتل ہو گیا ہوگا)۔